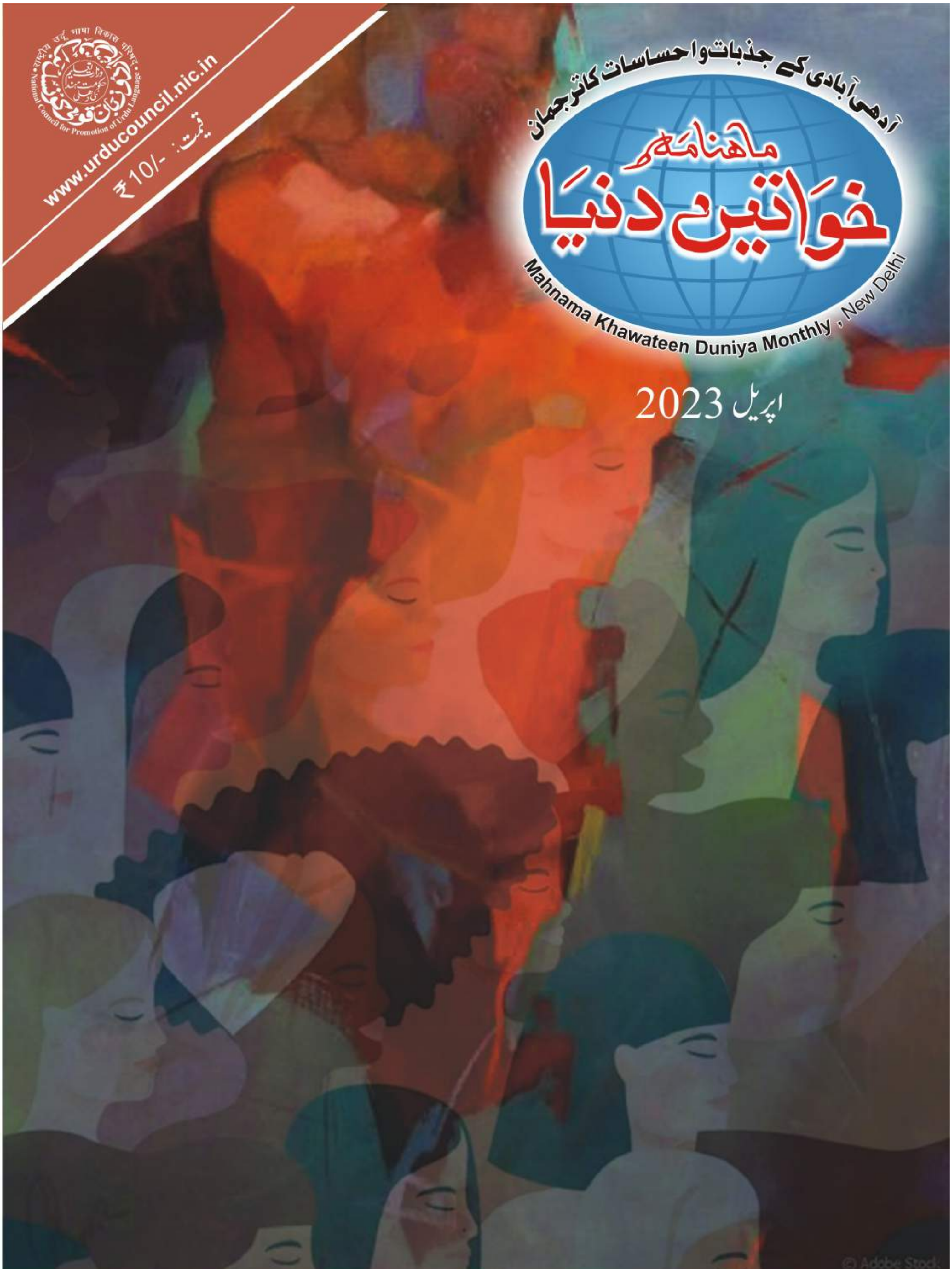

www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/10 ₹
آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi
اپریل 2023
© Adobe Stock

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

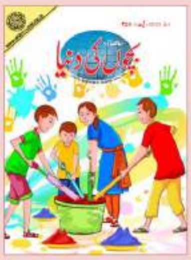

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

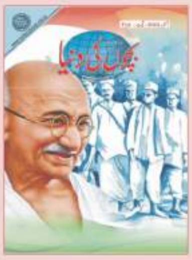

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

ادار یہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

فاطمہ تاج کی ادبی خدمات — مقبول حسین — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 8

جہان نسواں

صنفی تصورات: ایک سماجی تحقیق — قمر جمالی — 9

'شام زندگی' میں خواتین کے مسائل — ڈاکٹر سید محمد ظفر اقبال — 12

صغریٰ مہدی کا سفرنامہ 'سیر کر دنیا کی غافل' — محمد سلطان — 16

نذر سجاد حیدر کی ناول نگاری — ڈاکٹر محمد شفیع بھٹ — 21

گئو دان کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ — عبید الرحمٰن نصیر — 25

اپنی تہذیب اور دھرتی کا شاعر: امیر خسرو — ڈاکٹر اسماء مسعود — 28

بابو جی کی بیٹی: منظر و پس منظر — ڈاکٹر نظر امام — 33

سر سوتی اسنان کا تجزیاتی مطالعہ — انجم پروین — 37

اعتراف ہنر

جاوید نہال حشمی کی افسانچہ نگاری کا فنی اختصاص — فرزانہ پروین — 40

حسن سخن

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما، ڈاکٹر سمی اقبال — 44

افسانہ

جل اٹھے چراغ راہوں میں — خیر النساء علیم — 46

چھٹیاں — ڈاکٹر عنبر عابد — 51

سیل — افسانہ بانو — 53

صحت

گردے اور مثانے کی پتھری — 55

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 58

خواتین خبر نامہ — 60

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 4 اپریل 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد- 500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

عورت اور مرد کے مابین قدرت نے کچھ امتیازات رکھے ہیں۔عورت بنیادی طور پر مرد سے زیادہ جذباتی ہوتی ہے۔فطری طور پر جذباتی ہونے کے باعث کچھ ایسے احساسات بھی آجاتے ہیں جو اس کی ذات کا حصہ ہوتے ہیں۔وہ اپنی تخلیقات میں بھی کہیں نہ کہیں اس جذباتیت کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ اس کے جذبات اپنی مٹی سے جڑے رہتے ہیں اور انسانی اقدار کو وہ کبھی فراموش نہیں کرتی۔وہ اپنے اندر منفی سوچ کو فروغ نہیں دیتی۔وہ ہمیشہ رومانیت کی تلاش میں رہتی ہے اور یہی رومانیت آگے چل کر تحریروں میں ایک نیا روپ اختیار کر لیتی ہے۔عورت حقیقت سے زیادہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتی ہے۔وہ اپنی فطرت میں سادگی اور سچے جذبات کی تکمیل چاہتی ہے۔

ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔سماج افراد سے بنتا ہے۔سماج کے اصول وضوابط بھی معاشرے کے افراد کے ذریعے ہی تشکیل پاتے ہیں۔ایک تحقیق کے مطابق پہلے سماجی نظام امہاتی ہوا کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ حکمرانی مردوں کے حصے میں آئی اور انھوں نے عورتوں کے حقوق ان سے سلب کر لیے۔نتیجتاً عورتوں میں اپنے تشخص کے تیئں بیداری پیدا ہوئی اور ان میں اپنی ذات کو منوانے کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔سرمایہ دارانہ نظام کا آغاز ہوتے ہی عورتوں کی حیثیت معدوم ہوگئی۔اسی وجہ سے نسائی تحریک یا فیمینزم وجود میں آئی۔اس تحریک کے تحت عورتوں نے اپنے حق رائے دہی ، انتخاب لڑنے کا حق ، جائیداد کا حق ،مالی خودمختاری اور مساوی مواقع کے مطالبات شروع کر دیے۔

جب تحریک نسواں کی دوسری لہر آئی تو اس میں سب سے زیادہ زور حقوق نسواں پر تھا۔اس لہر کے تحت مساوی اجرت، مساوی مواقع، زچہ بچہ کے حقوق، حاملہ عورتوں کے حقوق اور مرد وزن کے مساوات پر زور دیا گیا۔اسی اثنا میں سیمون دی بوائر کی کتاب 'دوسری جنس' شائع ہوئی اور اس سے اشتراکی فیمنزم کی تحریک نے جنم لیا۔یہ کتاب عورتوں کی نابرابری، طبقاتی اور معاشی استحصال کے خلاف پرزور احتجاج کرتی ہے۔

فی زمانہ عورتوں کی حالت میں بہت حد تک تبدیلی آئی ہے۔پھر بھی عورتیں مکمل طور پر خودمختار نہیں ہیں اس لیے وہ مساوی حقوق اور یکساں مواقع پر زور دیتی ہیں۔عورتوں کے ساتھ روا رکھے گئے ہر سلوک کو وہ اب مکمل طور پر تبدیل کرنا چاہتی ہیں۔آج کی عورتیں بیدار ہو رہی ہیں۔اور اس بیداری کے مثبت اور مفید نتائج بھی ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مقبول حسین

فاطمہ تاج کی ادبی خدمات

حیدر آبادِ دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ پہلی تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ مالقابائی چندا اور دوسری جدید تحقیق کے مطابق اب اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کا تعلق اسی سرزمین دکن سے ہے۔ اس کے بعد بھی حیدر آباد دکن کی شاعرات کی ایک طویل فہرست ہے جن میں شفیق فاطمہ شعریٰ، بانو طاہرہ سعید، بشیر النساء بیگم بشیر اور عظمت عبدالقیوم جیسے مختلف نام ہیں؛ جن کی بدولت حیدر آباد دکن میں شعر و ادب میں خواتین کی نمائندگی نہایت نمایاں رہی ہے اور ''محفل خواتین'' کے قیام کی بدولت یہ سلسلہ نا صرف جاری و ساری ہے بلکہ مستحکم اور توانا ہوا ہے۔

حیدر آباد دکن کی شاعرات میں ایک ممتاز، منفرد اور معتبر شاعرہ و ادیبہ تاجِ سخن فاطمہ تاج بھی رہی ہیں۔ فاطمہ تاج کو ان کی خدمات کے باعث ''تاجِ سخن'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ فاطمہ تاج نے ادب کی مختلف اصناف میں لکھا اور خوب لکھا ہے۔ فاطمہ تاج نے افسانے، خاکے، رپورتاژ، مضامین، طنز و مزاحیہ مضامین اور انشائیے لکھے۔ انھوں نے حمد، نعت، سلام، غزل، نظم اور قطعہ وغیرہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کے فکر و فن کی داد دینے والوں میں پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر بانو طاہر سعید، فاطمہ عالم علی خاں، سلطانہ شرف الدین، روحیقا دری، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، رضیہ منظور الامین، پروفیسر حبیب ضیاء، صدیقہ شبنم، سید ہاشم، صالحہ الطاف، صلاح الدین نیر، اور فریدہ زین جیسی نامور شخصیات ہیں جنھوں نے ان کے فکر و فن کی ستائش کی۔

فاطمہ تاج کا مکمل نام تاج النساء، تخلص تاج اور قلمی نام فاطمہ تاج ہے۔ 25 اکٹوبر 1948 کو ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید جمال اللیل مدنی تھا۔ ان کے شوہر کا نام حبیب احمد بالفقیہہ تھا جنھوں نے ان کے ادبی سفر میں ان کا بھرپور تعاون کیا۔ ان کے ''دلاسا'' کتاب کا انتساب فاطمہ تاج نے اپنے سرتاج کے نام کیا ہے۔ ابتدائی کئی برس فاطمہ تاج نے خاموشی سے گزار دیے۔ بعد ازاں ان کی ادبی جذبات نے جب انگڑائیاں لیں تو انھوں نے اولاً سید احسان علی عرشی سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں امیر احمد خسرو، نایاب سلطانہ اور صلاح الدین نیر کی معاونت اور رہبری حاصل کی۔ اپنے گھریلو ماحول کے بارے میں انھوں نے

یوں اظہار خیال کیا'' گھر کے روایتی ماحول نے ہمیشہ میری کم علمی پر طنز تو کیا لیکن کبھی یہ مشورہ نہیں دیا کہ میں بھی کوئی سرکاری امتحان دے لوں، کوئی ڈگری حاصل کرلوں، چودہ سو سال پہلے کا طریقۂ زندگی اب بھی ہمارے گھر میں رائج ہے۔ میرے والد خالص حجازی تھے لیکن وہ میری شعر گوئی سے بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ چھوٹی سی عمر میں ننھی منی غزلیں لکھ لیتیں جو آداب شاعری سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے بے وزنی کا شکار رہتیں، میرے والد نے اس سلسلے میں سید احسان علی عرشی مرحوم کو بحیثیت استاد مقرر کیا تھا (امانت ص ۷) بعد ازاں یہ مشق سخن جاری رہتے رہتے ایک وہ وقت بھی آیا کہ فاطمہ تاج محفل خواتین سے وابسطہ ہوئیں اور اس محفل کی ایک فعال اور متحرک رکن رہیں۔ اسی طرح روزنامہ سیاست حیدرآباد میں ان کے کلام کی مستقل اشاعت سے انھیں کافی حوصلہ ملا۔ جب ان میں خود اعتمادی بڑھی تو انھوں نے مختلف اصناف ادب میں لکھا اور خوب لکھا۔ بالآخر ان کی کم و بیش پندرہ (15) کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام یوں ہیں۔ (1) اب کے برس (شاعری) (2) حوصلہ (نظمیں (3) امانت (نثر) (4) چاندنی کا آئینہ (شاعری) (5) دلاسا (طنز و مزاح) (6) پھول غزل کے (شاعری) (7) خوشبوئے غزل (شاعری) (8) ہیرے بھی پتھر ہیں، (9) ایک چراغ، (10) آس پاس (افسانے) (11) وہ ناولٹ، چھاؤں کی چادر، (12) دھوپ کی کلیاں، (13) من مانی (طنز و مزاح) 14۔ موسم کی طرح رشتے (افسانے) 15 بات ابھی باقی ہے وغیرہ۔ ادب کی مختلف اصناف کے متعلق فاطمہ تاج کی یہ کتابیں ان کی ادبی صلاحیتوں کی بھرپور ترجمان ہیں۔

فاطمہ تاج بسیار گو شاعرہ تھیں۔ ان کے مختلف شعری مجموعے ان کی سخن روانہ دسترس پر دلالت کرتے ہیں۔ فاطمہ تاج نے ہمیشہ اپنی زندگی میں عزم و ہمت اور حوصلہ مندی کے چراغ کو روشن رکھا۔ وہ ہمت کی پستی کا شکار نہیں ہوئیں۔ ان کے مختلف اشعار ہیں جو ان کے آہنی عزم و حوصلہ کو ظاہر کرتے ہیں:

تمام عمر تلاشِ سحر میں رہتے ہیں
ہم ایسے لوگ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں
اپنے سفر میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی
ہر منزلِ شعور پہ عزم جواں رہا
کاٹی ہے زیست ہم نے صلیبوں کی چھاؤں میں
ہم اہلِ حق تھے، ہم کو کسی کا بھی ڈر نہ تھا
سوچتے کیا ہو چلے آؤ اجالوں کی طرف
ورنہ گم ہو کے اندھیروں میں بکھر جاؤ گے

فاطمہ تاج کا غزلیہ رنگ بھی ملاحظہ کیجیے

ہوک اٹھتی ہے دل میں رہ رہ کر
جب بھی رقصِ بہار ہوتا ہے
عہدِ وفا کو توڑ کے وہ جا چکے ہیں تاج
ترکِ وفا سے اور بھی نامِ وفا ہوا
حالانکہ دلِ زندہ میں ایک آگ لگی ہے
سب لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ فصل ہری ہے
کسی کی یاد میں گزری ہے ساری زندگی اپنی
کہ پلکوں پر ستاروں کو سجانا یوں بھی آتا ہے
وہ جو حالِ دل نہ کہہ دے وہ جو رازِ دل نہ سمجھے
وہ نظر نظر نہیں ہے، وہ زباں زباں نہیں ہے

فاطمہ تاج نے حسن و عشق کے معاملات کو بھی بڑے سلیقے سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے سخن کا یہ انداز درج ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

تیغِ جفا سے آپ ہی زخمی نہیں ہوتے
ٹوٹے ہوئے ہیں ہم بھی تو تلوار کی طرح
تاج کس طرح اس کو سمجھاؤں
ہنسنے والا بھی غم رسیدہ ہے
تم کیوں دلِ پژمردہ کی پرسش پہ بہ ضد ہو
کب دردِ مسلسل کا یہ چہرہ نہیں غماز
اس کو ہے اطمینان کہ زخمی نہیں ہوں میں
مجھ کو یہ ہے گماں مرا چارہ گر تو ہے

یہ اصولی بات ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک الگ مضمون بیان کیا جاتا ہے جبکہ نظم میں از اول تا آخر ایک ہی مضمون کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس طرح وحدت مضمون اور وحدتِ تاثر نظم کی اہم خصوصیات ہیں۔ بنیادی طور پر نظم گوئی کے لیے طبیعت کی روانی کی اشد ضرورت ہوتی ہے ورنہ پوری نظم میں خیالات کا بہاؤ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ایک ہی مرکزی خیال کے تحت سارے خیالات گردش کرتے ہیں۔ یہ نظم کی اہم خوبی ہوتی ہے۔ فاطمہ تاج کی نظموں کے مطالعے سے ان کی شاعرانہ طبیعت کی روانی اور آمد کی کیفیت واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ فاطمہ تاج نے محاسبہ، رشتہ، اماں سے، احساس، امید، لمحہ ماضی، تلاش، یاد کے ساغر، نجومی سے، ذوق سفر، زندگی یا موت، برائے کتبہ، اے ندیم، اصرار، ضبط تمنا، ہجوم

ہجر میں ،آئینہ ،سلویٰ ،شکایت ،سلسلہ صدیوں کا ،اشکوں کی دیوار ،تسلی غم ،انکشاف ،عدمِ تعاون ،غمِ نہاں ،شناسائی ،تواضع ،مطالبہ بوسینا ،شہرِ خموشاں ،سالِ نو ،زلزلہ ،ارتعاش ،درد ،التجا ، جواب ،برف کے پھول ،منظر پسِ منظر ،دل درد کا دریا ہے ،وصیت ،نظم مسلسل ،معذور لڑکے کا خط ،شدت ، رگِ جاں میں جیسے عنوانات پر نظم کہی ہیں ۔منظور الامین اور صدیقہ شبنم نے ان کی نظم گوئی کی ستائش کی ہے ۔ چنانچہ منظور الامین نے ان کی نظم گوئی کے تعلق سے اپنا خیال یوں ظاہر کیا:

''ان کی تازہ ترین تخلیق 'حوصلہ' کی نظمیں سادہ و حسین ہیں اور ان میں وہ کیفیت ہے جو دل سے نکلتی ہے اور دل کو چھو لیتی ہے''۔(حوصلہ ص 11)

اسی طرح صدیقہ شبنم کا خیال ہے کہ ''فاطمہ تاج کی نظموں میں رومانیت کا غلبہ ہے ۔مجھے امید ہے کہ عصری زندگی کے تجربات اور احساسات بھی رفتہ رفتہ ان کی شاعری میں پائے جائیں گے۔''
(حوصلہ، ص 14)

فاطمہ تاج کی ایک مختصر سی نظم ''نہ جانے۔۔۔'' ملاحظہ کیجیے

نہ جانے کون سا لمحہ ہو آخری لمحہ
کسے خبر ہے کہاں وقت جا کے تھم جائے
بہت ہی تیز دھڑکنے لگا ہے دل میرا
مجھے تو آج یہ احساس ہو رہا ہے کہ بس
نہ جانے کب یہ اچانک دھڑک کے رُک جائے
مجھے خبر ہے کہ اب شام ہونے والی ہے
مگر ہے دل کو یہی آرزو کہ شام نہ ہو
اگر ہو شام تو یہ زندگی تمام نہ ہو

(حوصلہ، ص 40)

''برف کے پھول'' کے عنوان سے ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

برف کے پھول نئے موسم میں
صبح دم مجھ پہ برس جاتے ہیں
زندگی کے میرے پیاسے لمحے
ایک قطرے کو ترس جاتے ہیں
برف کے پھولوں میں خوشبو ہے نہ رس ہے ساتھی
کیا کروں مجھ کو مگر زیر سما جینا ہے

(حوصلہ، ص 113)

مندرجہ بالا دو نظموں سے فاطمہ تاج کی شاعرانہ طبیعت کی روانی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے:

فاطمہ تاج ایک بیدار مغز اور عالی دماغ شاعرہ تھیں ۔ان میں بھرپور ادیبانہ صلاحیتیں پائی جاتی تھیں ۔ چونکہ طنز و مزاح ہر ذی شعور انسان کی طبیعت کا خاصہ ہوتا ہے ۔اسی لیے فاطمہ تاج نے بھی طنز و مزاح کے اپنے جوہر نثر میں دکھائے اور باضابطہ طنز و مزاح کی طرف اپنا رخ موڑا۔ اس سلسلے میں ان کا احساس تھا کہ

تاج کہی ہے زیست کا حاصل
شوقِ تبسم، دیدۂ گریاں

ان کے نزدیک زندگی کے حاصل میں دیدۂ گریاں کے ساتھ ساتھ ''شوقِ تبسم'' بھی ہے ۔جس کا بھرپور اظہار ان کی کتاب'' دلاسا'' ہے۔'' دلاسا'' میں طنز و مزاح پر مشتمل ان کے مختلف مضامین شامل ہیں۔ جن میں خزانہ میری تلاش میں ہے ،ہمیں بھی جشن کی سوجھی ،بکرا اتر گیا، ہم نے بھی لڈو بانٹے ،سیاست ،دورِ ترقی اور ہم ،ہم اور ہمارے وہ ،آج کل ،اخبار اور ہم ، تنگ آ کے آخر ،ہم اور ہمارے ڈاکٹر ،تہذیب کے انڈے ،ہم اور مکھی کرفیو، موسموں کا مزاج ،لب ڈب ، ہنستے رہئے ، نیند ہماری ،ہنسی آتی ہے ،ہنسی کی قیمت ، بے محل اور لہجہ جیسے عنوانات پر مزاحیہ انداز میں لکھا ہے ۔فاطمہ تاج کے مزاحیہ مضامین پر رائے دیتے ہوئے مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے یوں لکھا کہ ''فاطمہ تاج کے مضامین تازگی، شوخی، بذلہ سنجی کا مرقع ہیں، انھوں نے مزاج کو سطحی انداز میں نہیں برتا، ان کا غم شرارہ بن کر رگ و پے میں اترتا اور نوکِ قلم سے کبھی طنز اور کبھی مزاح کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔''(دلاسا، ص 7)

غرض فاطمہ تاج کا اسلوب طنز و مزاح کے لیے بھی اتنا ہی رواں دواں تھا جتنا سنجیدہ ادب کے لیے رواں دواں تھا، ایسی قابل شاعرہ و ادیبہ کا انتقال 19 رجنوری 2020 کو ہو گیا۔ مگر ان کے فکر و فن کے معیاری نمونے ادب میں انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ فاطمہ تاج ہی کے ایک شعر پر اس مضمون پر اس مضمون کا اختتام کیا جاتا ہے :

مدتوں انجمن میں زخموں کی
تاج تیرا ہی تذکرہ ہوگا

Maqbool Hussain
H. No.1.6.373, Fish Market
Musheerabad
Hyderabad-500020 (Telangana State)

شاعرات کے منتخب اشعار

رات تو شوق سے سنتی ہے کہانی میری
دن کہاں سنتا ہے آشفتہ بیانی میری

دل تو کہتا ہے کہ میں کرتی رہوں سیر جہاں
روز ہوتی ہی رہے نقل مکانی میری

راحت سلطانہ

خواب کی تعبیر کا قصہ نرالا بن گیا
خود فریبی زندگی کا اب سلیقہ بن گیا

دفعتاً اک مسکراہٹ تیرے لب پہ آئی ہے
چاہتوں کا میری اب یہ اک ٹھکانہ بن گیا

روزینہ ترانیکر دگھے

زیست کیا ہے حماقتوں کے سوا
چند ظالم صداقتوں کے سوا

ہم نے دانشوروں سے کیا سیکھا
الجھی الجھی عبارتوں کے سوا

ربیعہ فخری

وہ جس کا ساتھ نبھانے کا حوصلہ نہ ہوا
بچھڑ گیا تو بھلانے کا حوصلہ نہ ہوا

ادھر ادھر کے سنائے ہزار افسانے
دلوں کی بات سنانے کا حوصلہ نہ ہوا

خالدہ عظمی

دل تو ہے ایک مگر درد کے خانے ہیں بہت
اس لیے مجھ کو بھی رونے کے بہانے ہیں بہت

کون سی بات کریں کس سے بچائیں پہلو
جو کبھی ختم نہ ہوں ایسے فسانے ہیں بہت

رضیہ فصیح احمد

ایک سرگوشی میں اپنی بات کہہ جاتا ہے کوئی
پاس جب کوئی نہیں تو پاس آ جاتا ہے کوئی

ایک ویراں شہر کو آباد کر جاتا ہے کوئی
اک دل ناشاد کو یوں شاد کر جاتا ہے کوئی

سلمیٰ حجاب

ہر ایک دور میں منظر بدلتے رہتے ہیں
ہماری فکر کے محور بدلتے رہتے ہیں

حریم جاں کو منور کریں گے کیا وہ چراغ
کہ جن کے طاق برابر بدلتے رہتے ہیں

پروین ام مشتاق

برے دنوں میں مجھے یوں سنبھال سکتا تھا
وہ اپنے خواب مرے دل میں پال سکتا تھا

اسے بچانا تھا تیراک بھی نہیں تھی میں
مجھے یہ فیصلہ مشکل میں ڈال سکتا تھا

رتو کوشک

(بحوالہ ریختہ ویب سائٹ)

قمر جمالی

صنفی تصورات ایک سماجی تحقیق

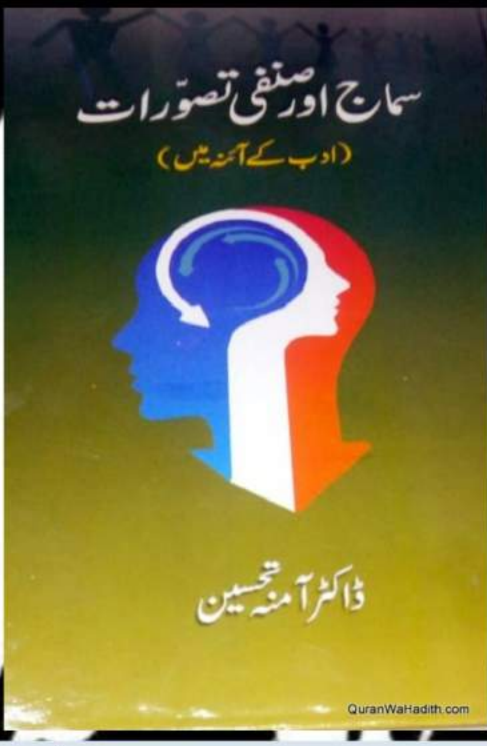

روٹی روزی کا امکان وحصول:

اس کے تعاقب میں دوڑ لگانا ایک فطری بات ہے۔ لیکن یہ آج کل ہر شعبہ ہائے حیات کی ضرورت بن گیا ہے۔ یہ رویّہ تعلیمی شعبے میں بہت ضرر رساں ہے۔ کیونکہ ـــــ اشاعتِ علم محض ایک ذمہ داری نہیں کہ ضرورت پوری ہوئی اور ہاتھ جھاڑ لیں۔ اس لیے کہ ترسیل علم جزوِ حیات اور تسلسلِ حیات کا ایک قرینہ ہے ـــــ ایک وراثت ہے جو صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہے۔ اس میں دیانت داری بشرطِ استواری ممکن ہے۔ آج کل ایسے ذمہ دار اساتذہ خال خال ہی ہیں۔ جس طرح طبّی شعبہ اپنی ساکھ، عزت اور وقار کھو چکا ہے، تعلیمی شعبہ بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔ تاہم تعلیمی شعبہ ابھی اتنا کنگال نہیں ہوا۔ اس لیے کہ......

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ڈاکٹر آمنہ تحسین کا شمار ایسے ہی بے غرض، بے ریاء اور دیانت دار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی روٹی روزی بھی ایک ایسے ادارے سے جڑی ہے جس کا مقصد اشاعتِ علم ہے یعنی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ریاست تلنگانہ' سابقہ آندھرا پردیش، حیدرآباد۔

ہندوستان جب لسانی بنیادوں پر تقسیم ہوا تو تعلیمی نظام میں ''لسانی اہمیت'' ہی مدبرین کے آگے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہوگئی، کیونکہ غیر ملکی زبان کا وسیلۂ تعلیم بن جانے کے بعد تعلیمی معیار کمزور پڑ گیا۔ آزاد ہندوستان میں اس کے سدِّ باب کے لیے بہت سی کوششیں شروع ہوئیں۔ سب سے اہم مسئلہ جو سب سے پہلے اٹھایا وہ تھا اسکولی تعلیم کے حصول میں زبان کا انتخاب۔ چونکہ سکنڈری ایجوکیشن کمیشن 53-1952، کوٹھاری کمیشن 66-1964، تعلیمی پالیسی 1986، نیز قومی تعلیمی پالیسی 2019 سب نے مادری زبان میں تعلیم کی ضرورت پر زور دیا اور Pedagogy کے ڈھانچے میں اس کی ضرورت کی سفارش کی۔

چونکہ ـــــــ

'اردو' ہندوستان کی کثیر الاستعمال زبان ہے، غالبًا اسی لیے M.A.N.U.U کا وجود عمل میں آیا، ساتھ ہی متعدد شعبے بھی متعارف کیے گئے، ان ہی میں ایک شعبہ تعلیمِ نسواں کے تحت قائم ہوا اور آمنہ تحسین اس شعبے کے قیام ہی سے اس میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ماشاء اللہ اب وہ فیکلٹی ڈپارٹمنٹ تو ہیں ہی فی الحال انچارج ڈائرکٹر آف ویمن اسٹڈیز بھی ہیں۔

جیسا کہ ـــــــ

میں نے بیان کیا کہ ڈاکٹر آمنہ تحسین اپنی تدریسی ذمہ داری کی تکمیل کے ساتھ ہاتھ جھاڑ لینے والی استاد نہیں ہیں، انھوں نے تعلیمِ نسواں کے ساتھ عورت کے تشخص اور اس کے وقار کے استحکام کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا حصہ بنایا اور شب و روز اسی کی جستجو میں لگی رہتی ہیں۔ اس کا عملاً ثبوت ان کی تخلیقات ہیں۔

1۔ مطالعاتِ نسواں (2008)
2۔ حیدرآباد میں اردو تحقیق (2010)
3۔ تانیثی فکر کی جہات (2012)
4۔ حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب (2016)
5۔ سماج اور صنفی تصورات (ادب کے آئینے میں) (2019)
6۔ Mainstreaming of the Indian Muslim Women-A way forward (Ed) 2015

ان کتابوں کے عنوانات ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر آمنہ تحسین نے عورت کے حقوق اور اس کے ساتھ ہونے والی صنفی زیادتی کے زیر اثر ان کے وجود کی مسخ ہوتی تصویریں اور ان کے Social Decadence کے خلاف جدوجہد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہمہ وقت ان موضوعات کو زیرِ بحث لا کر نسائی تعظیم و تکریم کے استحکام کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

ڈاکٹر آمنہ تحسین خود ایک ہونہار محققہ ہیں، ان کے تحت اب تک اٹھارہ (18) اسکالرز نے ''اردو ادب اور مطالعاتِ نسواں'' میں ایم فل اور پانچ (5) اسکالرز نے پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ان کی اپنے کام کی لگن، محنت اور حقیقت کی تلاشِ بسیار کی عادت انہیں عصرِ حاضر کی محققوں میں ممیّز کرتی ہے، آمنہ ایک باعمل خاتون ہیں، وہ حصولِ مقصد کے لیے اللہ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی اس آیت پر کاربند رہتی ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ .
(سورة الرعد: ١١)

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت جب تک کہ وہ نہ بدلیں جو ان کے جی میں ہے۔)

اس سے قبل ان کی کتاب ''حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب'' پر میں نے ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے، اب یہ نئی کتاب ''سماج اور صنفی تصورات......ادب کے آئینے میں'' میرے زیرِ مطالعہ ہے۔

یہ ایک پُر مغز کتاب ہے۔

اس کتاب کو سمجھنے اور مصنفہ کے مدعا کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے بنیادی طور پر ہمیں سمجھنا ہوگا کہ،

سماج کیا ہے____؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے لاتعداد جوابات انسان خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ' اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مگر غور کرو تو یہ ایک ایسا لفظ ہے، جس کی مکمل اور جامع تعریف ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

کیوں کہ____

''سماج'' ایک ایسا ادارہ (Institution) ہے، جس کا کوئی مادّی وجود نہیں ہے تاہم یہ انسان کو اپنے شکنجے میں ایسے جکڑے رکھتا ہے کہ انسان ہزار کوشش کے باوجود اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے کہ؛

"It is a fanatic institution that entangles man practically."

یعنی ______

سماج ایک مفروضہ ادارہ ہے۔ اس کے پاس؛

نہ لوہے کی بیڑیاں ہیں____ پھر بھی انسان خود کو جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

نہ گزند پہنچانے والے اوزار ہیں____ پھر بھی انسان ذرا سی لغزش پر پٹتا محسوس کرتا ہے۔

نہ جان لیوا ہتھیار ہیں____ پھر بھی انسان جب اپنی ہی غلطیوں کا بوجھ سہار نہیں سکتا تو موت کی آغوش میں پناہ لینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔

اور______

باوجود اس کے کہ سماج نے ہم پر کوئی استاد مقرر نہیں کیا____ پھر بھی ہمارا ضمیر ایک معلّم کی طرح ہمہ وقت ہم پر مسلط رہتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشّمس کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ:

> سماج ایک ایسا طاقتور ادارہ یا اکائی ہے جو انسان کو کامیاب زندگی سے ہمکنار بھی کر سکتا ہے اور زندہ در گور بھی۔

وہ اس لیے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، جو شعوری طور پر خود ہی بندشوں کا اسیر ہے، تب ہی تو (سوکراٹس) سقراط کہتا ہے:

"Man is born free, but every where the is in chains."

اس حقیقت ______ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عورت اور مرد دونوں ہی بنی نوع انسان

کی حیثیت سے سماج میں مساویانہ مقام رکھتے ہیں اور مساویانہ سلوک کے حقدار ہیں۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس سماج کے تشکیل شدہ تمام اصول وضوابط درست ہیں؟ خوشگوار ہیں؟ منصفانہ ہیں؟؟؟

ڈاکٹر آمنہ تحسین نے ان ہی سوالات کے جوابات اس کتاب ''سماج اور صنفی تصورات''میں قلمبند کیے ہیں۔

فاضل مصنفہ نے اس کتاب کو ـــــ 'حامیانِ صنفی مساوات' کے نام معنون کیا ہے جو ان کی جدّت طرازی اور حق پرستی اور موجودہ سماجی نظام سے انحراف کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔

اگر ہم اس کتاب کی مشمولات پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ مصنفہ نے کس خوبصورتی اور سلیقے سے سماج کے اصول وضوابط اور نسائی حقوق کا موازنہ کیا ہے۔ملاحظہ کریں۔

1۔ سماج اور صنفی تصورات اور نسائی ادب۔
2۔ ادب میں تصورِ نسواں
3۔ خواتین کی بدلتی حیثیت
4۔ خواتین کی شاعری ــــ نسائی حسّیت اور تانیثیت کے تناظر میں
5۔ خواتین کے افسانوں میں تانیثی فکر
6۔ نسائی ادب میں سماجی استحکام۔کشمیر کے حوالے سے وغیر

اور آخر میں چند ایک قلمکاروں کی ادبی تصاویر۔

اس ضمن میں ـــــ

ایک ضروری بات یہ ہے کہ آج کل کی سائنٹفک تحقیق کے مطابق صرف صنفی شماریات سے سماجی ضوابط کے غیر متوازن رویّے کو سمجھنا ناممکن ہے۔کیوں کہ یہ مطالعہ انسانی رویّوں سے متعلق ہے۔بالخصوص نسائی فکر، ان کی بے بسی، مجبور اور پدرسری روایات میں دبی کچلی ان کی شخصیت کے پرتوں کو کھولنے کے لیے Socialistic Analysis زیادہ مددگار ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ عورت صدیوں سے اپنی زبوں حالی' زبانِ حال سے بیان نہیں کر سکی۔وہ تو اپنی تحریروں میں بھی کھلا کھلا نہیں بلکہ بین سطور بیان کرتی ہے۔اس لیے ان صنفی غیر متوازن رویّوں اور غیر منصفانہ ضوابط کو سمجھنے کے لیے ادب سے اچھا اور کوئی ماخذ نہیں ہو سکتا۔اس کتاب میں آمنہ تحسین نے نہایت مدبرانہ انداز میں سماج کے حوالے سے صنفی تصورات کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔زیادہ کچھ کہنے سے بہتر یہی ہوگا کہ میں انھیں کا ابتدائیہ ''آغازِ سخن'' سے ایک اقتباس قارئین کے لیے پیش کروں۔

''ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا گیا ہے۔اس آئینے میں جہاں ملک کے سماجی، ثقافتی اور اقتصادی حالات کا بھرپور عکس نظر آتا ہے وہیں انسانی جذبات واحساسات نیز فکر وعمل کے بے شمار رنگ ہر سو بکھرتے ملتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ادب کے حوالے سے کسی بھی عہد و زماں کے حقائق اور اس عہد کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی حد تک جان سکتے ہیں۔''(صفحہ:7۔کتابِ ھذا)

آگے لکھتی ہیں:

''جب 1971 میں حکومتِ ہند کی جانب سے "Committee on the status of women" تشکیل دی گئی، اس کمیٹی میں ملک کی مایہ ناز سماجی سائنس دانوں اور ماہرینِ زبان وادب کو شامل کیا گیا۔سروے اور مختلف زبانوں کے ادب کے جائزے سے مجموعی طور پر ہندوستانی خواتین کی حیثیت جاننے کی کوشش کی گئی۔اس سروے کی رپورٹ "Towards Equality" کے عنوان سے 1974 میں منظر پر آئی۔اس رپورٹ کی اشاعت کے نتیجے میں ہندوستانی عورت کی پسماندہ حیثیت کو جاننے اور ان کی بہتری کے لیے حکمتِ عملیوں کو اپنانے کی طرف پالیسی سازوں کی توجہ مرکوز ہوئی۔''(کتاب ہذا۔صفحہ:8)

گو کہ ـــــ

اس کتاب میں شامل مواد خشک اور بیزار کرنے والا ہے۔مگر ڈاکٹر آمنہ تحسین نے اس قدر دلچسپ اور مہذب پیرایے میں قلمبند کیا ہے کہ ادھوری چھوڑ ناممکن نہیں ہے۔تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر آمنہ تحسین نے عورت کے ساتھ روا رکھنے والے (Derogatory Attitude) کو کبھی برداشت نہیں کیا ہے۔نہ اس کتاب میں اور نہ عملی طور پر مباحثوں میں۔اس طرح میں انھیں ایک Social Scientist تو مانتی ہی ہوں ساتھ ہی قلم کا سپاہی بھی گردانتی ہوں۔اللہ ان کے حوصلے اسی طرح بلند رکھے اور قلم ہمیشہ رواں رہے۔میں ان کی کتاب ''سماج اور صنفی تصورات۔ادب کے آئینے میں'' کے مطالعے کی پُرزور سفارش کرتی ہوں۔

□□□

Qamar Jamali
H.No: 4-5, Himagiri nagar colony,
gandamguda, Hydershahkote (post)
Hyderabad. 500091. (T.S.)
Mob: 9985503977

ڈاکٹر سید محمد ظفر اقبال

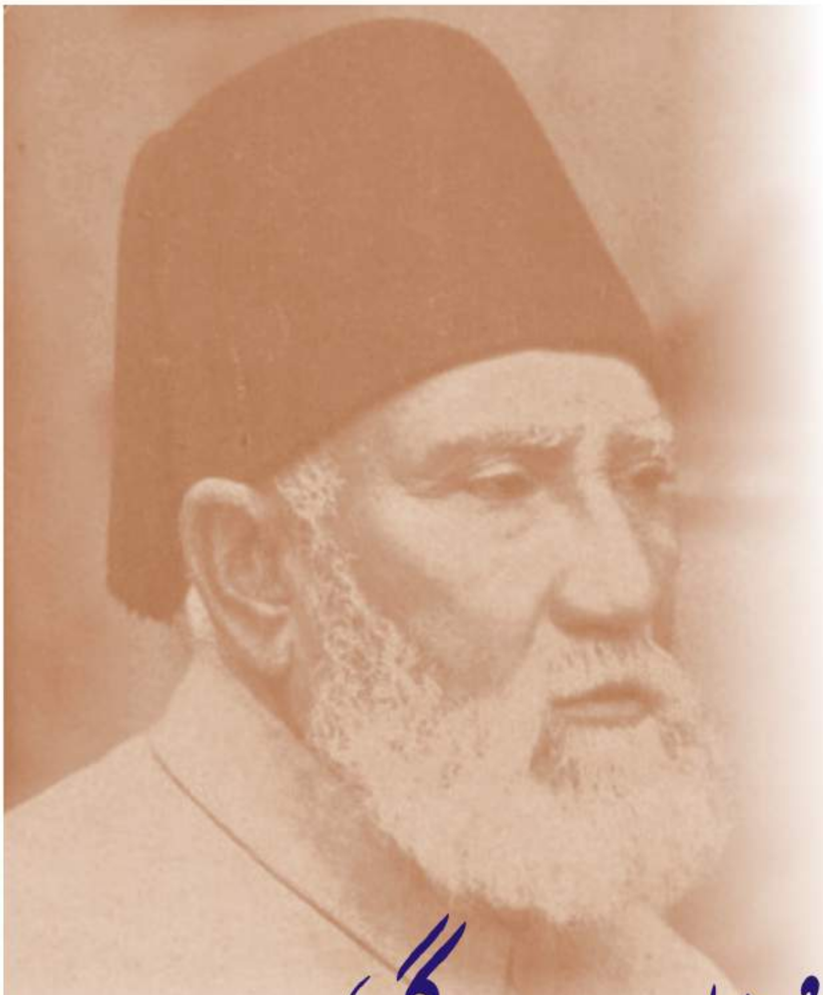

'شام زندگی' میں خواتین کے مسائل

راشد الخیری کا شمار بیسویں صدی کے ربع اول کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے مشرقی روایات کے استحکام کی کوشش کی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی ایام سے ہی مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات ہندوستانی معاشرے پر ہونے لگے تھے اور راشد الخیری کے نزدیک وہ تہذیب و تمدن قابل تقلید نہیں تھا چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مغربی تہذیب و تمدن کی خرابیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی مشرقی تہذیب و تمدن کی خصوصیات سے لوگوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔

''شام زندگی'' راشد الخیری کا سب سے کامیاب اور نمائندہ ناول ہے جو 1917 میں لکھا گیا۔ یہ معاشرتی ناول ہے۔ اس میں انھوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت، ان کی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل، شادی شدہ زندگی میں پیش آنے والے معاملات، شوہر و بیوی کے حقوق، اولاد کی تربیت، سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات، امور خانہ داری میں مہارت، سماج میں رائج غلط رسم و رواج وغیرہ جیسے موضوعات کو بیان کیا ہے اور ان کے حل کی تدابیر بتائی ہیں۔ انھوں نے اپنے پیغامات کی رسائی کے لیے نسیمہ کا کردار اخذ کیا ہے۔ نسیمہ ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار میں ساری خوبیاں موجود ہیں۔ اس کا بچپن، جوانی، بڑھاپا سب قابل رشک ہے۔ ناول نگار نے اپنے اس کردار کے ذریعے خواتین کی تربیت کی کوشش کی ہے۔

نسیمہ کی شادی قسیم سے ہوتی ہے۔ عام گھرانوں کی طرح نسیمہ کی سسرال میں بھی بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ساس کی خفگی برداشت کرنی پڑتی ہے، جٹھانیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں، نندوں کی

چالوں کا شکار ہونا پڑتا ہے، سسرالی رشتہ داروں کے طعن وتشنیع سہنے پڑتے ہیں لیکن نسیمہ ہر جگہ ثابت قدم رہتی ہے۔ ساس کے انتقال کے بعد نسیمہ کے ذمہ دو نندوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی آتی ہے جنھیں وہ بخوبی انجام دیتی ہے۔ اپنے بچوں کی تربیت اچھے طریقے سے کرتی ہے۔ ان کی شادی بیاہ کرتی ہے۔ ہر ہر قدم پر نسیمہ سماج میں رائج غلط طور طریقوں، رسموں اور رواجوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ ان کی برائیوں کی وضاحت کرتی ہے۔ راشد الخیری نے نسیمہ کے ذریعہ لمبی لمبی اصلاحی تقاریر اور وعظ کرائے ہیں جن میں خواتین کے مسائل اور ان کے حل بیان ہوئے ہیں۔

''شام زندگی'' اگرچہ ایک معاشرتی ناول ہے لیکن اس میں بعض جگہوں پر تہذیبی وتمدنی معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ بعض رسم ورواج کا ذکر ہوا ہے، ان کی خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ جن کی مدد سے ہم اس عہد کی طرز معاشرت اور طور طریقوں سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں پیدائش اور موت کے مواقع پر مختلف طرح کی رسمیں انجام دی جاتی رہی ہیں جن کی حیثیت مذہبی نہیں ہے لیکن تسلسل کے ساتھ اس پر عمل کرنے سے اس کی حیثیت مذہبی ہوگئی ہے اور کوئی بھی شخص اس سے انحراف کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

''شام زندگی'' میں راشد الخیری نے موت کے بعد کی رسموں کی حیثیت اور ان کی خوبیوں وخامیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ نسیمہ کا شوہر قسیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے لیکن جب اس کی ماں کا انتقال ہوتا ہے تو وہ معاشرے میں رائج فرسودہ رسم ورواج کو انجام دینے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ وہ ان رسوم کی خرابیوں کو جاننے کے باوجود اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا بلکہ ان رسموں کو انجام دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کی بیوی نسیمہ کا کردار ایک منفرد حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ ان رسموں کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ وہ اپنے شوہر قسیم کو سمجھاتی ہے کہ معاشرے میں قائم ان رسموں کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایصال ثواب اور مردے کی روح کے سکون کے لیے ضرورت مند اور مستحق افراد کی مدد کرنا مختلف بات ہے اور رسم ورواج کی ادائیگی الگ ہے:

''....موت کی خبر آناً فاناً میں پھیل گئی اور آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ قسیم کہنے کو تو بی۔ اے، پڑھا لکھا، نئی روشنی کی دلدادہ، ترک رسوم پر آمادہ تھا۔ مگر وقت پر اتنا بودا نکلا کہ کوئی بٹی بھی خیالات کی ایسی ہیٹی نہ ہوگی۔ پھولوں کا تخمینہ دو ہزار کا تھا۔ نسیمہ تجہیز وتکفین کے وقت تو خاموش رہی، مگر اس نے میاں سے صاف کہہ دیا یہ فضول صرف، حاصل دین نہ حاصل دنیا، کس کام کا؟ سوا اس کے کہ الفتے اور ہٹے کٹے اور موٹے تازے مفت کا کھانا اڑائیں۔ تم کو جو کچھ دینا ہے کسی مسجد، مدرسے یا یتیم خانے نقد بھیج دو۔ باقی پھولوں کی رسم بالکل فضول ہے۔ سب کو اطلاع دیدو کہ کچھ نہ ہوگا۔ جب ہم پڑھے لکھے ہی ان رسموں میں پڑ کر اپنی جڑیں کھوکھلی کر دینگے تو جاہلوں کا شمار کس گنتی میں رہا۔ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ کہ تم نے اس میں کیا فائدہ سوچا ہے۔ مردے کو ثواب کے واسطے میں خود زندہ بیٹھی ہوں۔ جو ہو سکے گا پڑھوں گی۔ اور پہنچاؤں گی۔

(شام زندگی۔ راشد الخیری۔ عصمت بک ڈپو، کراچی۔ سنہ 1963۔ ص:23)

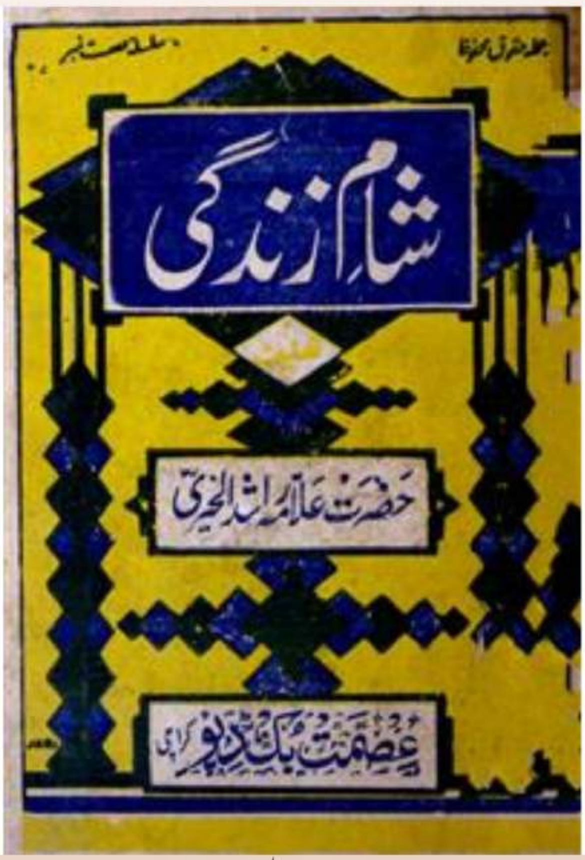

مندرجہ بالا اقتباس میں راشد الخیری نے نسیمہ کے ذریعہ سماج میں قائم ان فرسودہ اور کہنہ رسم ورواج کی خامیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جنھیں عوام میں مذہبی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور ان کو انجام دینا ہر حال میں لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ اگر کسی گھر میں موت ہو جاتی تھی تو تمام لوگوں کا کھانا میت کے گھر والوں کے ذمہ ہوتا تھا۔ اسی طرح مختلف مواقع پر الگ الگ طریقے سے گھر والے زیر بار ہوتے تھے۔ بہت سے گھرانوں کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان رسوم کی تکمیل کر سکیں تو وہ قرض لے کر

ان رسموں کو انجام دیتے تھے اور پھر پریشان حال زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ رسمیں انسانوں کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں لیکن دھیرے دھیرے ان کا رواج عام ہوجاتا ہے اور ہر شخص اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ راشد الخیری نے اس کی پرزور مخالفت کی ہے اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے اس کو معاشرے سے ختم کرنے کا پیغام دیا ہے۔

تحفے تحائف دینے سے آپسی محبت بڑھتی ہے لیکن اس کی حیثیت اگر رسمی ہوجائے اور اپنی بڑائی وخودنمائی کے اظہار کے لیے اگر اس کا استعمال کیا جانے لگے تو یہ مناسب نہیں ہے۔ ہندوستانی تمدن میں ایک رسم بڑی قدیم ہے کہ جب کسی کے گھر ملنے جلنے جاتے ہیں تو مٹھائی، پھل یا تحائف وغیرہ لے جاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے اس رسم کا استعمال اپنی حیثیت کے اظہار اور خودنمائی کے لیے کیا جانے لگا اور یہ لازم تصور کیا جانے لگا کہ اگر کسی نے مجھے تحفہ دیا تو جب میں اس کے یہاں جاؤں تو کم سے کم اسی قدر یا اس سے زیادہ لے جاؤں۔ بہت سے لوگ اس رسم کی وجہ سے ندامت اور احساس کمتری کا شکار ہونے لگے، کچھ لوگ قرض لے کر اس رسم کو انجام دینے لگے اور پریشانیوں کا شکار ہوئے۔ تحفہ دینے سے آپسی محبت بڑھتی ہے لیکن دھیرے دھیرے اس کی حیثیت بدلے کی ہوگی جو کہ اچھا نہیں۔

''شام زندگی'' میں ایک جگہ راشد الخیری نے اس رسم کی خرابیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک بیگم صاحبہ نسیمہ سے ملنے آتی ہیں اور مٹھائیوں سے بھری سینی اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ نسیمہ اس تحفے کو قبول کرنے سے معذرت کرتی ہے۔ اس رسم کی خرابیوں کو بیان کرتی ہے۔ نسیمہ اور بیگم صاحبہ کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ اس فرسودہ رسم کی خرابیوں کی وضاحت کے لیے قابل ذکر معلوم ہوتی ہے:

> ''....اگر آپ مجھے پہلے سے اطلاع دے دیتیں تو بہت اچھا ہوتا۔ میں یقیناً آپ کو آج تشریف لانے سے روک دیتی اور آپ کو ہرگز زحمت نہ ہوتی۔
>
> بیگم صاحب اطلاع کو کیا خاک جانیں۔ وہ اتنا سنتے ہی سناٹے میں رہ گئیں۔ پانچ روپے کی مٹھائی بیگم صاحب اپنے ساتھ لائی تھیں۔ ماما نے سینی آگے رکھی۔
>
> نسیمہ نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔''
>
> بیگم صاحب: ''میں صرف بچوں کے لئے لائی ہوں۔''
>
> نسیمہ: بچے آپ کی دعا سے جب ان کا دل مٹھاس کو چاہتا ہے کھا لیتے ہیں۔ یہ ہمارے شہر کی فضول چال ہے اور اس کے معنی دوسرے کی توہین۔ خیال فرمائیے اس مٹھائی کی ضرورت کیا اور میں اس کو کیوں لوں؟ ممکن ہے میری مالی حالت اس قابل نہ ہو کہ میں اتنی مٹھائی جب آپ سے ملنے آؤں اپنے ساتھ لا سکوں، تو مجھ کو اپنے دل میں کیسی ندامت ہوگی....'' (شام زندگی۔ راشد الخیری۔ ص:99-100)

مذکورہ بالا اقتباس سے ہم اس فرسودہ رسم ورواج کی خرابیوں سے کسی حد تک واقف ہوتے ہیں جو معاشرے میں رائج تھی اور جن کی انجام دہی لازمی تصور کی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس سوچ میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ آج بھی یہ رسم قائم ہے لیکن پہلے کی بہ نسبت آج اس کی حیثیت تبدیل ہوتی جارہی ہے اور اب یہ بطور ہدیہ پیش کی جاتی ہے نہ کہ مقابلے اور موازنے کے لیے۔

ہندوستانی معاشرے میں عورت کی دوسری شادی کو معیوب تصور کیا جاتا ہے اور سماج اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر کسی عورت کا شوہر مرجائے یا اسے طلاق ہوجائے تو اسے پوری زندگی بیوگی میں بسر کرنی پڑتی ہے اور طرح طرح کے طعن وتشنیع کا سامنا کرنا پڑتا ہے حالاں کہ اگر اس کی دوسری شادی کردی جائے تو وہ ایک پرسکون زندگی بسر کرسکتی ہے۔ راشد الخیری نے ''شام زندگی'' میں سماج میں قائم اس کہنہ رسم کو بھی موضوع بنایا ہے اور اس کی خرابیوں کو نسیمہ کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ نسیمہ کا دوسرا بیٹا وسیم بھری جوانی میں اس دارفانی سے کوچ کرجاتا ہے اور اس وقت کی رسم کے اعتبار سے اس کی بیوہ اس کے نام پر بیٹھی رہتی ہے۔ نسیمہ کی پہل سے اس کی دوسری شادی ممکن ہو پاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''.... بہو کو دعا دینی ضرور تھی مگر دعا کے ساتھ ہی خیال آیا کہ میں ماں ہوں۔ میری ممتا ہے۔ کلیجہ کا ٹکڑا تھا۔ دنیا کے سب عیش کرچکی۔ مگر یہ بدنصیب چار پانچ برس کی بیاہی جس نے میاں کی بہار دیکھی نہ بچوں کا سکھ، کیسی برباد ہوئی۔ اس کو رانڈ بٹھا کر مٹی پلید کرنا سخت ظلم اور کبیرہ گناہ ہے۔ میں مانتی ہوں یہ باہر کے لوگ ہیں۔ ان کے ہاں بیوہ کا نکاح سخت عیب ہے مگر ''فانك حوالا يا ملى منكم'' حکم صریح ہے۔ گو میرا دل نہیں مانتا کہ میری زندگی میں وسیم کی دلہن مجھ سے چھوٹے۔ بچے میرا گھر سونا کرجائیں اور پرائی دہلیز پر جاکر پڑیں مگر یقیناً اس کا عذاب مجھ پر ہوگا۔''

دل میں یہ باتیں کرتے کرتے وہ یکایک اٹھی اور سمدھن کو بلا

کر ان سے کہا۔'' یہ آپ کی صاحبزادی بیٹھی ہیں۔ میری تقدیر میں جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ مگر یہ بچہ ہے۔ اس نے ابھی دنیا کا کیا دیکھا ہے۔ چھ برس میں دو مہینے بھی لگ کر میاں کے ساتھ نہ رہی۔ دنیا اس کے واسطے دوزخ اور زندگی اس کے لئے مصیبت ہوگی۔ میں جانتی ہوں آپ لوگ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر میرا دل دیکھے کہ آپ نے اپنی بچی کو وسیم کے واسطے دلہن بنایا اور میں اپنے ہاتھ سے اپنی بہو کو غیر کے لئے دلہن بناتی ہوں....''

(شام زندگی۔ راشد الخیری۔ ص:151)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس وقت کی صورت حال بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد عورت کا کوئی پرسان حال نہیں رہتا۔ دوسری شادی کا تصور ہی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ والدین رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے تھے۔ سماج کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ راشد الخیری نے ان فرسودہ رسم و رواج اور طرز معاشرت کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے سماج میں پھیلی برائیوں کو اجاگر کیا اور ان برائیوں اور فرسودہ رسموں کو ختم کرنے کی بنیاد اپنے ناولوں کے ذریعہ ڈالی۔

نسیمہ خود اپنی بہو کی دوسری شادی کی تیاری کرتی ہے۔ اسے دلہن بناتی ہے، اس کا گھر آباد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ ایسے اقدامات ہیں جو اس عہد میں ناممکن تھے بلکہ آج بھی کسی بیوہ کی شادی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مذہب اسلام میں بیوہ کی دوسری شادی کو احسن تصور کیا گیا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں قائم رسم و رواج نے عورت و مرد کی دوسری شادی کو ایک مسئلہ بنا دیا ہے۔ راشد الخیری نے اس مروجہ رسم و رواج کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

''شام زندگی'' کے مطالعے کے بعد ہم انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی ایام کے طرز معاشرت سے کسی حد تک واقف ہو جاتے ہیں۔ اس عہد میں جس طرح کے طور طریقے، رسم و رواج اور معاشرت قائم تھی اور معاشرے میں خواتین کے ساتھ جس طرح کا ناروا سلوک اختیار کیا جاتا تھا ان خرابیوں سے راشد الخیری نے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ سماج میں قائم غلط طور طریقے، رسم و رواج اور معاشرے کے غلط تصورات کے بارے میں لکھ کر انھوں نے ایک نئے سماج اور معاشرے کو تشکیل دینے میں مدد کی ہے جس پر ہم عمل کر کے ایک بہتر سماج کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

□□□

Dr. Syed Md Zafar Iqubal
Assistant Professor
Dept. of Urdu
Z. A. Islami P.G. College
Ahmed Ghani Nagar, Chapiya,
Siwan-841226 (Bihar)

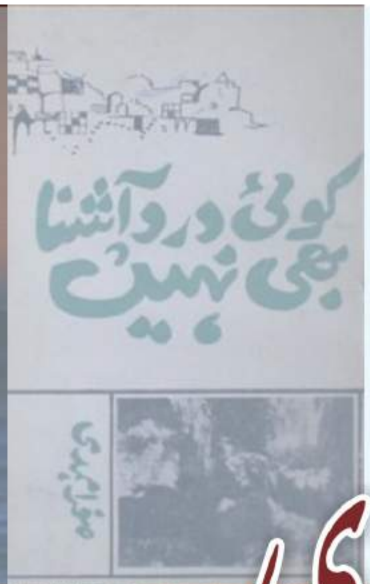

محمد سلطان

صغریٰ مہدی کا سفرنامہ
’سیر کر دنیا کی غافل‘

ادب کی اہم خواتین فکشن نگاروں میں صغریٰ مہدی کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں نے علمی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ تحقیق و تخلیق کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے کئی ناول شائع ہوئے جن میں پا بہ جولاں، دُھند، پروائی اور راگ بھوپالی کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ تنقید کے میدان میں ان کی تصنیف ’’اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ‘‘ حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سب کے علاوہ انھوں نے کئی سفر نامے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ جن میں سے سب سے اہم اور مقبول سفرنامہ سیر کر دنیا کی غافل ہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے ملک اور بیرون ملک کی سیر و سیاحت کی روداد بڑے دلکش انداز میں پیش کی ہے۔ یہ سفرنامہ کتابی صورت میں پہلی بار 1994 میں منظر عام پر آیا۔

سیر کر دنیا کی غافل کو بھوپال، نیویارک اور واشنگٹن کی چلتی پھرتی زندگی کا متحرک منظر نامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں انھوں نے اپنے سفر کے حالات و واقعات کو بہت ہی خوبصورت بیانیے اور دلکش طرز تحریر سے مزین کیا ہے۔ صغریٰ مہدی نے سفرنامے کی ابتدا میں سفر کی اہمیت و افادیت، قدیم و جدید دور میں سفر کے وسائل اور لوگوں میں سفر کرنے کا شوق وغیرہ کے متعلق گفتگو کی ہے۔ انھوں نے قدیم دور کی سفری صعوبتوں کے سامنے موجودہ دور میں وسائل کی فراہمی اور سیر و سیاحت کے شوق کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”آج نہ اونٹوں کی ضرورت ہے، نہ کشتیوں کی، ہزاروں میل کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے، سیاحوں کے آرام و آسائش کے لیے طرح طرح کے انتظامات موجود ہوتے ہیں۔ پھر بھی لوگوں میں سیر و سیاحت کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے، کسی سفر پر نکلنے کے اخراجات ان کے پاس جمع ہو جانے کے بعد بھی وہ پاس کے ایسے شہر میں چلے جاتے ہیں، جہاں اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ہو اور قیام و طعام کا انتظام مفت ہو سکے۔“

(صغریٰ مہدی، سیر کر دنیا کی غافل، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، اشتراک، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، سنِ اشاعت، 2012، ص:7)

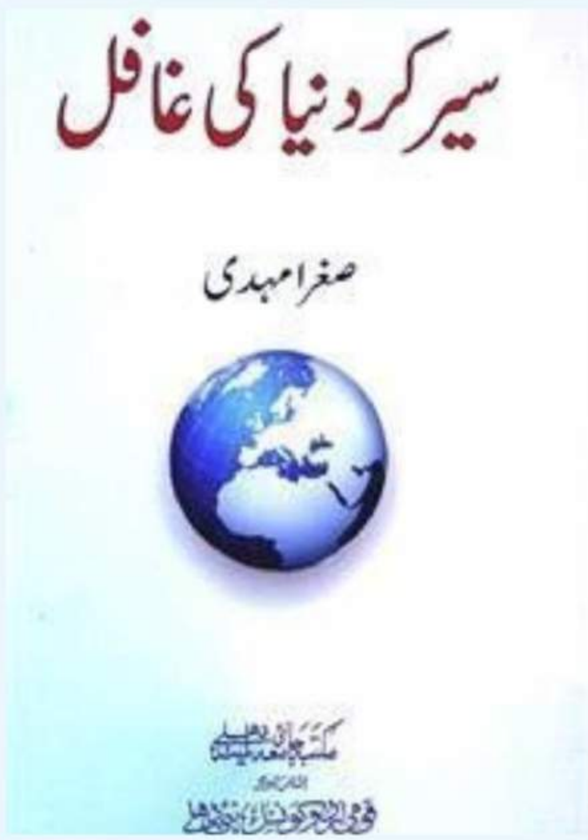

زیادہ تر سفرنامہ نگاروں کی طرز پر صغریٰ مہدی نے بھی اپنے سفرنامے کا آغاز سفر پر جانے سے قبل کی صورت حال سے کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ سفر کے اخراجات نہ ہونے کے سبب کن صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح سے لوگوں کے طعنے برداشت کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ سفر کے اخراجات نہ ہونے کے سبب غیر ملک کی سیر و سیاحت کا خیال ذہن میں رکھنا عبث ہی ہے لیکن صغریٰ مہدی نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئیں۔ یہاں تک کی وہ وقت بھی آیا جب انھوں نے رخت سفر باندھا اور نئی زمین اور نئے آسمان کی سیر پر نکل کھڑی ہوئیں۔ سفر کی اس خواہش کی تکمیل میں ان کی ممانی جو ہمیشہ صغریٰ مہدی کی خواہش کا خیال رکھتی تھیں انہیں حوصلہ دیتی ہوئی کہتی ہیں: ”تم باہر جاؤ میں وہاں حامدہ وغیرہ کو خط لکھ دوں گی، تمہیں ٹھہرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا“۔ لیکن اس حوصلے کے باوجود ابھی تک صغریٰ مہدی کشمکش میں تھیں کہ کیا یہ وقت سفر پر جانے کے لیے موزوں ہے؟ اُس وقت صغریٰ مہدی کے ذہن میں کون سی باتیں چل رہی تھیں اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ”اس رات میں نہ جانے کتنی دیر تک یہ سوچتی رہی کہ کیا واقعی مجھے جانا چاہیے؟ اپنے شوق پر اتنا روپیا خرچ کرنا مناسب ہے مگر دماغ نے لاتعداد ایسی دلیلیں سمجھانی شروع کر دیں۔ کہ روپیا خرچ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ سفر سے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف کی آیتیں یاد آئیں جن میں سیر و سیاحت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ سو ثابت ہوا کہ ہمیں جانا چاہیے۔“

مصنفہ نے سفر کے بنیادی مراحل مثلاً پاس پورٹ، ویزا اور ائیر پورٹ سے لے کر جہاز میں بیٹھنے تک کی تمام روداد اور اس دوران پیش آنے والی تمام مشکلات کا اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے جس سے ہمیں ان کی جزئیات نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بہت سارے مصنف ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے قرض لے کر سفر کیے۔ صغریٰ مہدی بھی ان ہی چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے قرض لیا۔ اپنے سفر پر جانے کی تیاریوں اور روپیوں کے بندوبست کے متعلق لکھتی ہیں:

> ”ٹکٹ تو آ گیا مگر ساتھ لے جانے کے لیے ایک پیسا نہیں تھا۔ اس کے لیے عزیزوں، دوستوں نے چندہ کر کے تین ہزار روپے کا انتظام کیا۔ اسٹیٹ بینک سے فوراً ایکسچینج میں

گیا، دوسو پچانوے پونڈ اور ہاں سترہ ڈالر اور بھی ملیں گے۔''

(ایضاً ،، ،ص:8)

ظاہری بات ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی نئی چیز کو دیکھتا ہے جو اس نے پہلے نہ دیکھی ہو، تو وہ چاہتا ہے کہ اسے قریب سے دیکھے۔ صغریٰ مہدی نے اس سے پہلے بڑے جہاز میں کبھی سفر نہیں کیا ہوتا ہے اس لیے جمبو جیٹ جیسے بڑے جہاز کو دیکھتے ہی وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ رات کے ایک بجے صغریٰ اپنے گھر والوں کے ساتھ ائیر پورٹ پہنچتی ہیں۔ جہاز کی شان و شوکت دیکھ کر حیرت ومسرت سے جھوم اٹھتیں ہیں۔ جس کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے:

''اس سے پہلے انڈین ائیر لائنز سے لکھنو اور پی آئی اے سے لاہور کا سفر کیا تھا۔ کہاں وہ ڈگمگاتے جھولتے چھوٹے چھوٹے کھلونے جیسے جہاز اور کہاں یہ جمبو جیٹ، خوبصورت اسمارٹ اور ایر ہوسٹز۔'' (ایضاً ،، ،ص:13)

کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور کے زیادہ تر سفر ناموں میں جزئیات سفر کو خصوصیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ بعض جزئیات سفرنامے کا اہم حصہ بن جاتی ہیں اور بعض سفرنامے کی ضخامت کا سبب۔ صغریٰ مہدی نے جن جزئیات سفر کو اپنے سفرنامے میں جگہ دی ہے وہ ان کے سفرنامے کی دلکشی میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ خواہ وہ جزئیات سفر پر روانگی سے قبل کی ہوں یا دوران سفر پیش آنے والے واقعات وحالات سے متعلق، ان کے ذکر سے سفرنامے کے لطف میں کسی قسم کی کمی یا بے جا عبارت آرائی کا احساس نہیں ہوتا۔

اگر اس سفرنامے کا تہذیبی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ صغریٰ مہدی نے جہاں بیرون ممالک کا ذکر کیا ہے، وہیں انھیں ہندوستان کا بھی خیال آجاتا ہے جس کا ذکر کبھی براہ راست تو کبھی اشارتاً کرتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً وہاں کے حالات، تہذیب اور خاص کر گاڑی چلانے والوں کے اطوار و گفتار کا ہندوستانی تہذیب اور ڈرائیوروں سے موازنہ بھی کیا ہے۔ دونوں جگہوں کے بس اسٹاپ اور سوار ہوتے لوگوں کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ پورا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دوران سفر خود سے ہونے والی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا ذکر بھی بلا جھجک کیا ہے۔ ملاحظہ کریں یہ اقتباس:

''پھر ایک کالے رنگ کی ٹیکسی ہمارے پاس آکر رکی اور ٹیکسی میں بیٹھے ایک خوبصورت، خوش وضع انگریز نے دروازہ کھولا اور پوچھا، کہاں جانا ہے۔ ''گلینڈن روڈ۔'' ان حضرت نے سامنے رکھی موٹی سی ڈائریکٹری اٹھائی اور انہماک سے اس کا مطالعہ کرنے لگے۔ کئی منٹ بعد بولے وہ گلینڈن روڈ نہیں بلکہ گلنیڈن روڈ ہے اور اس کا صحیح تلفظ بتانے کی کوشش کی جو میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر شفقت سے مسکرائے اور ٹیکسی اسٹارٹ کردی۔ میرے کانوں میں وطن عزیز کے ٹیکسی ڈرائیور کی ساری بدکلامیاں گونج رہی تھیں جو وہ اس صورت حال میں کرتے۔''

(ایضاً ،، ،ص:13)

صغریٰ مہدی ایک باذوق سیاح کی طرح بیرون ملک کی مختلف جگہوں کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کرتی ہیں۔ انھوں نے لندن وامریکہ کی مختلف جگہوں، وہاں کے ماحول اور دوڑتی بھاگتی زندگیوں سے واقفیت حاصل کر کے اپنے قارئین کو بھی ان سے متعارف کرایا ہے۔

نیو یارک کے متعلق لکھتی ہیں:

''نیو یارک امریکہ کا مشہور ترین شہر ہے جس کا نام سن کر ہم نہایت مرعوب ہوجاتے تھے۔ جسے دیکھنے کی آرزو برسوں سے تھی۔ جہاں یو۔ این۔ او کا دفتر ہے وہ اس قدر خوفناک ہے! نیو یارک کی اونچی ترین عمارتیں، فیکٹریاں، کارخانے، اپارٹمنٹ کمپلیکس بہت دیر تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ پین سلیونیا سے بالٹی مور تک بہت خوبصورت راستہ ہے۔ جنگل، کھیت، جھلیں، جھرنے اور قدرتی مناظر۔''

واشنگٹن کے متعلق لکھتی ہیں:

''واشنگٹن شہر بہت پر رونق شہر ہے۔ قدم قدم پر تاریخی عمارتیں ہیں۔ جیفرسن کا مقبرہ کیپٹول لنکن مانومینٹ، کنیڈی کی یادگار لبرٹی مانومینٹ لمبی کشادہ سڑکیں ہرے بھرے لان، جیفرسن مقبرے کے سامنے بہتا دریا جس کے کنارے کنارے چیری کے بے شمار پیڑ وہاں سیر کرتے بھانت بھانت کے لوگ، چلتے پھرتے ریستوراں، وائٹ ہاؤس جہاں امریکہ کا صدر بیٹھ کر دنیا کو اپنے اشاروں پر نچانے کی کوشش کرتا ہے'' (ایضاً ،، ،ص:17)

'سیر کر دنیا کی غافل' میں موجود سفرنامہ بچپن کی تلاش میں صغریٰ مہدی نے بھوپال کی سفری روداد کو قلمبند کیا ہے۔ بھوپال ان کی یادوں کا وطن رہا ہے۔ یہ ان کے بچپن کی سرزمین ہے جس طرح ہر کسی کو اپنے بچپن کی سرزمین سے محبت ہوتی ہے صغریٰ کو بھی اس سے گہری وابستگی ہے۔ اسی

لیے انھوں نے بھوپال سے اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ صغرا کی منفرد طرزِ تحریر کا کمال یہ ہے کہ اپنائیت کے جذبات کے باوجود بھی قلم اٹھاتے وقت وہ اپنے شدت جذبات پر خوبصورتی سے قابو پالیتی ہیں، جذبات واحساسات میں توازن قائم رکھتی ہیں جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی تحریر غیر فطری مبالغہ اور بے لطف و بے وجہ تصنع اور تکلفات سے پاک ہے۔ بھوپال کے تعلق سے لکھتے ہوئے انھوں نے سفرنامے کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

''سب سے پہلے میٹرک کے امتحان کا فارم بھرتے ہوئے جائے پیدائش کے خانے میں بھوپال لکھا تو اس شہر سے اپنائیت کا پہلا احساس جاگا۔ اپنے بزرگوں، عزیزوں اور بڑی بہنوں سے بھوپال کا ذکر بچپن سے سنتے آئے تھے مگر خود بھوپال بالکل یاد نہیں تھا، باڑی جہاں ابتدائی بچپن گزرا تھا وہ یاد تھی۔'' (ایضاً // ،ص:83)

بچپن کی سنی ہوئی باتیں اور دیکھی ہوئی چیزیں انسان کو اکثر یاد رہتی ہیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے یادوں کی لطافت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر یادوں کی مٹھاس اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ تلخ یادیں خوشگوار اور لطیف محسوس ہونے لگتی ہیں۔ بھوپال میں صغریٰ اپنی یادوں کی تلاش میں گم ہو جاتی ہیں۔ یہاں انھوں نے اپنے ماضی کو تلاش کیا اور بچپن کے آثار کو دیکھنے کی جستجو کی ہے۔ بھوپال کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج، شعر وادب، اخلاق و عادات، مہمان نوازی اور شائستگی پر اپنے مختصر قیام میں بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں کا قدرتی حسن ان کے دل کو موہ لیتا ہے اور وہ اپنے والہانا احساس کا مخصوص انداز میں اظہار کرتی ہیں:

''سہ پہر میں بارنا ندی میں موٹر بوٹ میں بیٹھ کر تادیر اس میں گھومنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہندوستان میں ایسی خوبصورت اور حسین جگہیں ہیں جن سے ہم واقف ہی نہیں ہیں، کتنے لوگ مدھیہ پردیش کے دور افتادہ مقام پر آتے ہوں گے اور اس خوبصورت اور حسین مقام کے قدرتی مناظر اور دلکش فضا سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ ندی کے کنارے گھنے جنگلوں میں ہرنوں کے جھنڈ، پانی میں تیرتی بطخیں اور مرغابیاں جہاں تہاں دل چھیننے والے ناچتے مور، میں تو مبہوت ہو کر رہ گئی۔'' (ایضاً // ،ص82,83)

تخلیق کاروں کے سفرناموں میں اسلوب کی سطح پر فکشن اور سفرنامے میں آمیزش ہونے کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے مگر ان کی گہری اور دوررس نگاہیں چیزوں کے انتخاب کے دوران فکشن اور روداد سفر کے امتیاز کا خیال رکھتی ہیں۔ ان کے سفرناموں میں موجود افسانوی رنگ اور تخلیقیت سفرنامے کو دلکش بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ان سفرنامہ نگاروں کے یہاں ان کی تخلیقی صلاحیت کے سبب بہترین جزئیات نگاری، مرقع کشی، فکشن اور طنز ومزاح کی چاشنی بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ صغریٰ مہدی نے اپنے اس سفرنامے میں فکشن کے عناصر کی آمیزش سے جابجا اپنا مذاق اڑاتے ہوئے طنز ومزاح کی چاشنی بھر دی ہے۔ ذیل میں چند اقتباس اس حوالے سے ملاحظہ کریں:

''ہم جیسا بھولا بھٹکا انسان جب قرض لے کر سیر وسفر کا ارادہ کرتا ہے تو بے وقوف لقب پاتا ہے، جی ہاں یہ لقب ہمیں اس وقت ملا جب ہم کو انگلستان کی سوجھی۔۔

ممانی جان سفر کی تکان اور پھر بجلی نہ ہونے سے پریشان تھیں۔ ہماری میزبان خواتین بجلی غائب ہونے پر یوں شرمندہ تھیں کہ جیسے اس کے غائب ہونے میں ان کا ہاتھ ہو۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی ہاتھ تھا۔۔

تو آپ آگئیں بھوپال، اقبال مسعود ممانی جان سے مل کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ جی نازل ہو گئے۔''

(ایضاً // ،ص:89)

صغرا مہدی کا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم مدّت میں زیادہ سے زیادہ گھومتے پھرتے اور ہر چیز کو باریک بینی سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ خوبی ان میں اس لیے پائی جاتی ہے کہ وہ ایک حقیقی سیاح کی طرح سفر ہی کو اپنا مقصد اور منزل بنا کر گھر سے نکلتی ہیں۔ جہاں جہاں بھی وہ پہنچتیں ہندوستانیت اور ہندوستان کی محبت ان کے دل میں جاگزیں رہتی۔ ٹورنٹو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے صغرا مہدی نے ہندوستانی کھانوں کا بھی بھرپور ذکر کیا ہے۔ یہاں کے کباب، پراٹھے، چاندنی چوک اور محرم کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے جس سے ٹورنٹو کی ہندوستانیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان تمام جزئیات کو اس طرح لکھا ہے کہ قاری ٹورنٹو جیسے نامانوس شہر میں اپنے پن کی خوشگوار فضا میں سانسیں لینے لگتا ہے۔ ٹورنٹو کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ کریں:

''لوگ پیدل چلتے بھی نظر آئے۔ بھانت بھانت کے مگر نہ آپا دھاپی نہ دھکم پیل، کتابوں کی بڑی بڑی دکانیں مختلف تھیٹرس اور ایک چھوٹا چاندنی چوک، جہاں میٹھے پان، سیخ کباب، چھولے بھٹورے، جلیبیاں، شمع، آستانہ، شبستان

اور وہاں سے نکلنے والے کئی اردو رسالے اور اخبار بِک رہے تھے۔ جہاں پانچ ڈالر میں سو پان مل رہے تھے۔ ان سے ملا ہوا ایک پکچر ہال تھا جہاں ''اندھا قانون'' چل رہا تھا۔ معلوم ہوا اس تھیٹر میں انڈین فلمیں ہی آتی ہیں۔

یہاں بہت بڑی تعداد میں پاکستانی اور ہندوستانی آباد ہیں، جہاں میلاد، مجلس، مشاعرے اور افسانوں کی شامیں اکثر و بیشتر ہوتی ہیں۔ (ایضاً)

علاوہ ازیں صغریٰ مہدی نے اپنے سفرنامے کے اس مجموعے میں موریشس کے سفر کی روداد بھی بیان کی ہے۔ وہاں کے خوبصورت مناظر اور جزیروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سفر میں ان کی ملاقات اردو ادب کی بڑی بڑی شخصیات سے ہوتی ہے۔ جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، خلیق انجم، پروفیسر وہاب اشرفی، ابوالکلام قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ اس سفر کے دوران انھوں نے موریشس میں اردو ہندی کے فروغ پر بھی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں ''وہاں اردو ہندی بولی، پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ وہاں سے طالب علم علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور لکھنؤ اردو، ہندی پڑھنے آتے ہیں۔''

اس سفرنامے میں صغرا مہدی نے ''ذرا یہیں پڑوس میں'' کے عنوان سے ایک باب رکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے سفر پاکستان کی روداد بیان کی ہے۔ اس سفر میں بہت سارے ادیبوں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے جن میں انھوں نے، الطاف فاطمہ، ممتاز مفتی، رشید امجد، منصور قیصر، رخسانہ صولت، منشاءالرحمٰن اور اختر جمال وغیرہ کا خصوصی طور سے ذکر کیا ہے۔ تقسیم ہند و پاک پر جس طرح اردو ادب میں مختلف لوگوں نے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں، صغریٰ مہدی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار اس سفرنامے میں کیا ہے۔ ملاحظہ کریں یہ اقتباس:

''ہندوستان، پاکستان تو ہمیں ایسے لگتے ہیں جیسے ایک بہت بڑے گھر میں رہنے والے دو بھائیوں نے لوگوں کے بہکانے اور کہنے سننے میں آ کر بٹوارا کر لیا ہے اور ایک لمبی اور اونچی دیوار کھڑی کر لی مگر دونوں دیوار کے اِدھر اُدھر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ذرا بھی غافل نہیں ہوتے۔'' (ایضاً)

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ صغرا مہدی کا سفرنامہ سیر کر دنیا کی غافل'' نہ صرف ایک سفری روداد ہے بلکہ مختلف شہروں اور ملکوں کی تہذیبی، سماجی اور معاشرتی حالات و کوائف کا متحرک منظرنامہ ہے۔ جس میں سفرنامہ نگار کے احساسِ جمال اور مناظر کائنات کی رنگا رنگی کے ساتھ اس کے مشاہدات و تجربات کی ایک چلتی پھرتی دنیا کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

□□□

Mohd Sultan
Research Scholar
Urdu Department,
Panjab University
Sector 14
Chandigarh-160014 (U.P)

ڈاکٹر محمد شفیع بھٹ

نذرِ سجاد حیدر کی ناول نگاری

انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں صنفِ نسواں نے اردو میں ناول لکھنا شروع کیا۔اس سے قبل ان کے ناول نہیں ملتے۔اردو کی اولین قصہ گو خواتین نے ابتدائی دور میں قصے نما ناول لکھے لیکن انھوں نے ناول لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ناول نگاری میں عبور حاصل کرلیا۔ابتدائی دور کی خواتین ادیباؤں نے صنفِ اناث کی زندگی کے بے شمار مسائل کو نہایت ہُنر مندی اور تجربہ کاری سے اپنی فکشن نگارشات کا موضوع بنایا۔اس دور کی خواتین فنکاروں نے زیادہ تر حقوقِ نسواں، تعلیم نسواں اور اصلاحِ معاشرہ کے مقصد سے ناول لکھے۔ابتدائی دور کی بیشتر خواتین ادیبائیں اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشدالخیری سے متاثر نظر آتی ہیں لیکن بعض خواتین قلمکار نذیراحمد اور راشدالخیری سے متاثر ہوئے بغیر اپنے طور پر زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کوشاں رہیں۔اس دور کی خاتون ناول نگاروں میں رشیدۃ النساء بیگم، اکبری بیگم، محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر، صغریٰ ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، فاطمہ بیگم، طیبہ بیگم، ظفر جہاں بیگم اور ثروت آرا بیگم قابلِ ذکر ہیں۔

خواتین ناول نگاری کی تاریخ میں جن ابتدائی کاوشوں کی نشاندہی کی جاتی ہے ان میں نذر سجاد حیدر کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔نذر سجاد حیدر نے بنت نذر الباقر کے نام سے تخلیقی میدان میں قدم رکھا۔وہ اردو ادب میں رومانوی تحریک کے سرخیل اور صاحبِ طرز ادیب سجاد حیدر یلدرم کی شریکِ حیات اور اردو کی مایہ ناز فکشن ادیبہ قرۃ العین حیدر کی والدہ تھیں۔رومانوی تحریک کے روحِ رواں سجاد حیدر یلدرم کے عقد میں آنے کے بعد انھوں نے نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھنا شروع کیا۔نذر سجاد حیدر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جدید فکر و نظر رکھنے والی خاتون تھیں۔وہ اپنی علمی اور اختراعی صلاحیتوں کے سبب اردو فکشن میں ایک اہم مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔انھوں نے کئی ناول لکھے جن میں اختر النساء بیگم، حرماں نصیب، آہِ مظلوماں، ثریا، جاں باز اور نجمہ قابلِ ذکر ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اپنی والدۂ محترمہ کے تخلیق کردہ ناولوں کا ایک کلیات بنام ''ہوائے چمن میں خیمۂ گل'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی سے 2004 میں شائع کرایا۔

نذر سجاد حیدر نے جب اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تو یہ بیسویں صدی کے اوائل کا دور تھا۔یہ دور ہندوستان کے سیاسی و سماجی اعتبار سے تغیر و تبدل کا دور تھا۔پرانی اقدار اور روایات برق رفتاری سے بدل رہی تھیں لیکن عوام کا

ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل نئی تبدیلیوں کو تسلیم کرنے پر مستعد نہ تھا۔ اس وقت سماج کا ایک بڑا طبقہ ہنوز دقیانوسی ذہنیت کا شکار تھا بالخصوص طبقۂ نسواں معاشرے کے جاہلانہ رسم ورواج کی قیود میں گرفتار تھا۔ ایسے وقت میں خواتین ادیباؤں نے اپنے فن پاروں میں صنفِ نازک کی مجبوری، لاچاری، بے بسی وکسمپرسی، ان کی سماجی اور معاشی حیثیت کو بہ احسن وخوبی پیش کیا ہے۔ ان ہی خواتین میں نذر سجاد حیدر کا نام بھی اہم ہے، جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے معاشرے میں عورت کی حیثیت کو مسخ کرنے والی بے شمار بندشوں اور حصار کو توڑنے کی کوششیں کیں۔ نذر سجاد حیدر تحریکِ آزادئ نسواں کی فعال رکن رہی ہیں، انھوں نے حریتِ نسواں اور حقوقِ نسواں کے ان گنت مسائل کو اپنی تحریروں کے توسط سے منظرِ عام پر لانے کی سعی وجہد کی۔ بقول نیلم فرزانہ:

''نذر سجاد حیدر آزادئ نسواں اور تعلیمِ نسواں کی تحریک کی ایک موثر رکن رہی ہیں۔ اس زمانے کے مختلف رسائل (تہذیبِ نسواں، خاتون، عصمت) میں شائع ہونے والے مضامین ان کی ذاتی جدو جہد کا واضح ثبوت ہیں۔ مضامین اور افسانوں کے علاوہ ان کے تمام ناول ان کی اسی جدو جہد کا ثمرہ ہیں۔''

(اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، نیلم فرزانہ، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2014، ص43)

''اختر النساء بیگم'' (1910) نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول میں نسوانی زندگی کی کربنا کی، اصلاحِ معاشرہ اور پدرسری معاشرے کے دوش بدوش بوسیدہ رسم ورواج پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اپنی والدۂ محترمہ کے اس پہلے ناول کے بارے میں لکھتی ہیں:

''امی نے چودہ سال کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اصلاحی ناول لکھا، جس کی ہیروئن اختر النساء بیگم نے مردوں کے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقلمندی سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتحمند ہوئی۔ عموماً مرد امی کے ان ناولوں میں نہایت دغاباز، ریاکار، اور بے ہودہ دکھائے جاتے تھے۔ ہیرو بے حد فرشتہ صفت ہوتا تھا۔ امی کے یہ سارے ناول ان کے طبقے کے اس پس منظر کی بہت ہی عمدہ عکاسی کرتے تھے جس نے پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے اوپری طبقے کی طرح یورپین تہذیب اختیار کرنی شروع کردی تھی۔''

(سفینۂ غمِ دل، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2013، ص24)

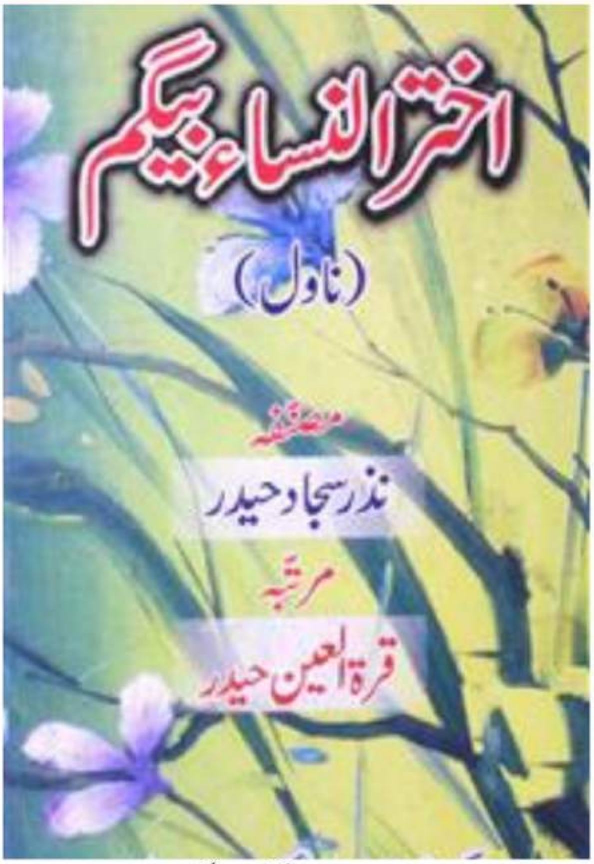

نذر سجاد حیدر نے اختر النساء بیگم کی زندگی کو اس ناول کا مرکز ومحور بنایا ہے۔ وہ ناول کی ہیروئن ہے اور نہایت مہذب اور ذہین لڑکی ہے۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاندان سے ہے لیکن سوتیلی ماں اور سسرال کی ناخواندگی کے باعث اس کی زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ اختر النساء بیگم کی کلفت واذیت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

''......اس وقت کوئی بھی اس کے کمرے میں نہ تھا۔ اختر بالکل تنہا تھی۔ فرش سے اٹھی، پہلے وہ کپڑے اور زیور علیحدہ کیا۔ پھر پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی یا اللہ آج یہ کیا ہوگیا؟ گو مجھے اپنی بدنصیبی تو پہلے ہی سے معلوم تھی جس دن میری اماں! آہ، پیاری اماں جان مجھ سے جدا ہوئیں۔ اس دن سے میں خوش نہ رہی۔ پھر بیگم صاحبہ آئیں۔ مجھ پر بڑی مصیبت پڑی۔ لاڈلی آئی تو جان اور بھی عذاب میں ہوگئی۔ پھر میں اپنی پیاری خالہ جان اور پیارے بہن بھائی سے جدا کی گئی۔ یہ صدمہ میرے لیے کچھ کم نہ تھا۔ آہ! یہ اچانک گولہ کہاں سے آپڑا!! افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں کہ میں آج

سے جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں، وہ لوگ کون ہیں؟ کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہوگی اس کی عادات، مزاج، اخلاق، تعلیم، عمر، خیالات، نام تک بھی مجھے معلوم نہیں۔ مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں۔ وہ سوتیلی ماں ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی کرے بجا ہے۔ ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے، انھوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کر دیا۔''

(ہوائے چمن میں خیمۂ گل، مرتبہ: قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2004، ص 152 تا 153)

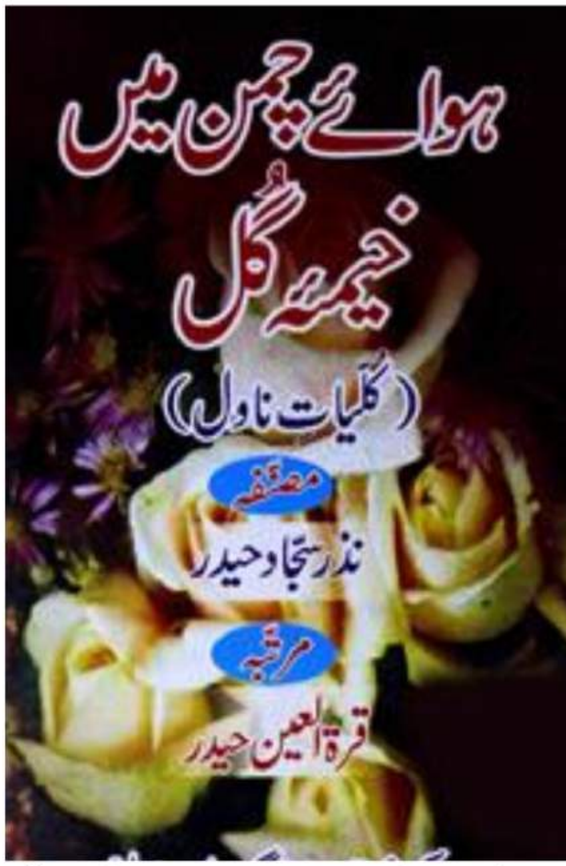

ناول ''حرماں نصیب'' میں نذر سجاد حیدر نے جہاں ایک بہن کی بھائی کے تئیں بے پناہ محبت کا قصہ بیان کیا ہے وہیں فیروزہ اور ظفر کی ناکام داستانِ عشق کو بھی قلمبند کیا ہے۔ فیروزہ اپنے بھائی فیروز سے بے تحاشہ محبت کرتی ہے، ان کی اچانک موت کے سبب وہ اپنے محبوب ظفر کو داغِ حرماں دے کر اس سے دوری اختیار کر لیتی ہے۔ ظفر کے سمجھانے کے باوجود فیروزہ شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتی اور گوشہ نشیں ہو کر زندگی گزارنا پسند کرتی ہے۔ فیروزہ ڈاکٹری کی تعلیم پڑھ کر مفلس و نادار لوگوں کی خدمت کرتی ہے تاکہ اس کے بھائی کی روح کو تسکین پہنچے۔ مصنفہ نے اس ناول میں عورت کی بے لوث محبت اور ایثار و قربانی جیسے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے نسائی حسیت کا ایک عظیم نمونہ پیش کیا ہے۔

''آہِ مظلوماں'' (1914) ایک معاشرتی ناول ہے۔ اس ناول میں نذر سجاد حیدر نے تعدد ازدواج جیسے پیچیدہ مسئلے کو پیش کیا ہے۔ ترنم ریاض اس ناول کی بابت رقمطراز ہیں:

> ''نذر سجاد حیدر جو سماجی اور اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں اپنے ناول ''آہِ مظلوماں'' میں کثیر الازدواجی (Polygamy) سے پیدا شدہ مسائل کو نہایت بے باکی سے ابھارا ہے۔''

(بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، مرتبہ: ترنم ریاض، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 2004، ص 10)

مذکورہ ناول سماج کے دو طبقہ جات (اعلیٰ اور متوسط) کی ترجمانی کرتا ہے۔ اعلیٰ طبقے کی کہانی میں ڈپٹی کمشنر عزیز الرحمٰن پہلی بیوی سلطنت آرا کی موجودگی میں ایک شاطر اور بدکردار عورت کے جھانسے میں آ کر عقدِ ثانی کر لیتا ہے۔ دوسرے قصے میں آبادی بیگم نامی عورت اپنے بیٹے عظمت اللہ کا ازدواجِ ثانی حرص و ہوس میں کرنا چاہتی ہیں جبکہ پہلی بیوی سلیقہ شعار، خدمت گزار اور تابعدار ہے۔ ناول کے دونوں قصوں کا انجام بالآخر انتہائی المناک ہوتا ہے۔ مصنفہ اس ناول میں وحدتِ ازدواج (Monogamy) کی خوبیوں اور کثرتِ ازدواج (Polygamy) کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے کثیر الازدواجی کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

''جاں باز'' (19-1918) نذر سجاد حیدر کا ایک اور ناول ہے جس میں انھوں نے وطن پرستی کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کی ہیروئن زبیدہ میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ایک سچے محبِّ وطن کی حیثیت سے وہ سیاست میں کود پڑتی ہے اور آزادئ ملک کی خاطر گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک میں عملی طور پر حصہ لیتی ہے۔ وہ ایک قوم پرست لڑکی کے کردار میں ناول میں نظر آتی ہے جس کی منگنی قمر نامی ایک نوجوان لڑکے سے ہو چکی ہوتی ہے۔ قمر ایک آزاد خیال اور مغربیت کا شیدائی شخص ہوتا ہے۔ زبیدہ قمر سے عشق تو کرتی ہے لیکن قمر کو اس کا گاندھی ازم پسند نہیں ہوتا ہے۔ ایک طرف زبیدہ کو مغربی طرزِ زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں دوسری جانب قمر اپنی منسوبہ کو کھادی کپڑوں میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اسی اثنا میں قمر اپنے ہم خیال خاتون نجمہ کے دام فریب میں آ کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔ نجمہ اپنی حد سے زیادہ آزاد خیالی سے قمر کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے اور قمر نجمہ سے رشتۂ ازدواج میں بندھنے پر کفِ افسوس ملتا ہے۔ بعد ازاں زبیدہ اور

قمر کے درمیان تعلقات استوار ہوجاتے ہیں، نجمہ کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ قمر کو اغوا کر لیتی ہے۔کہانی کے آخر میں نجمہ اپنے کیفر کردار تک پہنچتی ہے اور زبیدہ و قمر ہمیشہ کے لیے ایک ہوجاتے ہیں۔

''ثریا''(1930) بھی ایک انتہائی دلچسپ معاشرتی ناول ہے۔اس میں نذر سجاد حیدر نے بغیر زبردستی شادی کے بھیانک نتائج کو پیش کیا ہے۔اس ناول کا مرکزی محور ثریا کا کردار ہے جو کہ تعلیم یافتہ اور حسین و جمیل لڑکی ہے۔اس کے والدین انتقال کر چکے ہیں۔دادی اس کی پرورش و پرداخت کر رہی ہے۔ثریا کی دوستی بنگالی خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی موہنی سے ہے۔موہنی کے بھائی سندرلال جب بیرسٹری پاس کر کے انگلستان سے لوٹتے ہیں تو ان کے یہاں اس کی خوشی میں ڈنر پارٹی ہوتی ہے۔اس پارٹی میں ثریا کی ملاقات سندرلال کے دوست نواب کیواں قدر سے ہوتی ہے۔دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں اور کسی کے علم میں لائے بغیر شادی کر لیتے ہیں۔کیواں قدر کے گھر والے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں معلوم پڑتا ہے کہ اس نے ثریا سے شادی رچالی ہے۔وہ اس رشتے کو ناپسند کرتے ہیں اور کیواں قدر کو محروم الارث رکھنے کی دھمکی دیتے ہیں۔کیونکہ ان کے والدین عہدِ طفلی میں ہی کیواں قدر کی نسبت سلطنت آراء سے طے کر لی تھی۔اس طرح کیواں قدر کے والدین اسے دوسری شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔اسی درمیان ثریا اپنے اندر نئے مہمان کو محسوس کرتی ہے۔وہ لکھنؤ کو خیر باد تو کہتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان کی زندگی میں پریشانیاں آتی رہتی ہیں۔کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کیواں قدر پھر سے ثریا کے قریب آجاتا ہے اور اپنی دوسری بیوی کو اپنے والدین کے پاس چھوڑ کر ثریا کے ساتھ ہی اپنی باقی ماندہ زندگی گزرانے کا تہیہ کر لیتا ہے۔نذر سجاد حیدر نے مذکورہ ناول میں معاشرے کے انتہائی حساس پہلو کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے یعنی والدین اپنے بچوں کی عین مرضی کے خلاف شادی بیاہ کر دیتے ہیں۔مصنفہ اس اہم مسئلے کے خلاف سراپا احتجاج ہے، اس کا اظہار انھوں نے کیواں قدر کے اپنے والدین کے لکھے ہوئے خط میں یوں کیا ہے:۔

> ''حضور جانتے ہیں کہ مجھے سلطنت آراء بیگم (بیوی) سے ذرا محبت و موانست نہیں ہے۔اس صورت میں اُن سے کیسے نباہ کر سکتا ہوں جب کہ میری دل و جان کی مالک مجھے مل گئی ہے۔اُمید کرتا ہوں کہ آپ میرے دلی حالت کا اندازہ کر کے اس میری بے ادبی کو معاف فرمائیں گے اور آئندہ اپنے پوتوں کی شادیوں کے وقت احتیاط سے کام لیں گے اور ان کی شادیاں ان کی مرضی کے موافق کریں گے۔''

(ہوائے چمن میں خیمۂ گل، مرتبہ: قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004، ص660 تا661)

''نجمہ'' (1939) نذر سجاد حیدر کا ایک اور اہم ناول ہے جو اصلاحی نوعیت کا ہے۔اس ناول میں ایک مغربی تہذیب کی گرویدہ دوشیزہ کی حسرت ناک داستانِ حیات قلمبند کی گئی ہے۔مصنفہ نے مذکورہ ناول میں ہندوستانی معاشرے کے دو طبقوں کی نشاندہی کی ہے، ایک وہ قدامت پرستوں کا طبقہ ہے جو مغربی معاشرے کی ہر بات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، چاہے وہ اچھی ہو یا بری۔دوسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال تصور کرتے ہوئے مغرب کی تقلید کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہے۔۔نذر سجاد حیدر قدیم طرز کی پابندیوں اور مغربی تہذیب کی اندھا دُھند تقلید کی دو انتہاؤں کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔انھوں نے اس ناول میں مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کی کشمکش اور امتزاج کو نمایاں کرتے ہوئے دونوں کے مثبت پہلوؤں کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ ایک آئیڈیل معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔

مختصر یہ کہ نذر سجاد حیدر ہندوستانی معاشرے کی اصلاح و بہتری کی خواہاں تھیں۔ ان کا شمار اپنے عہد کی خاتون سماجی اصلاح کاروں Social Reformers میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں طبقۂ اناث کے گھریلو اور سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے معاشرے میں فرسودہ اور قدیم رسم و رواج کا خاتمہ، تعلیمِ نسواں، حقوقِ نسواں اور حریتِ نسواں کا پرچار نہایت موثر اور معنی خیز پیرائے میں کیا ہے۔ہر چند کہ نذر سجاد حیدر کے ناول فنی طور پر مکمل نہیں ہیں اور پلاٹ کے اعتبار سے ان میں بعض دفعہ تسلسل ٹوٹتا نظر آتا ہے لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ یہ تخلیقات اپنے دور کے مخصوص سماجی ماحول کی آئینہ دار ہیں۔

❑❑❑

Dr. Mohd Shafi Bhat
Lecturer (C)
Model Govt. Degree College
Charar-i-Sharief
Budgam-191112 (J & K)
Mob:6005706273
E-mail:bhattshafi786@gmail.com

عبیدالرحمٰن نصیر

گئودان کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی جائزہ

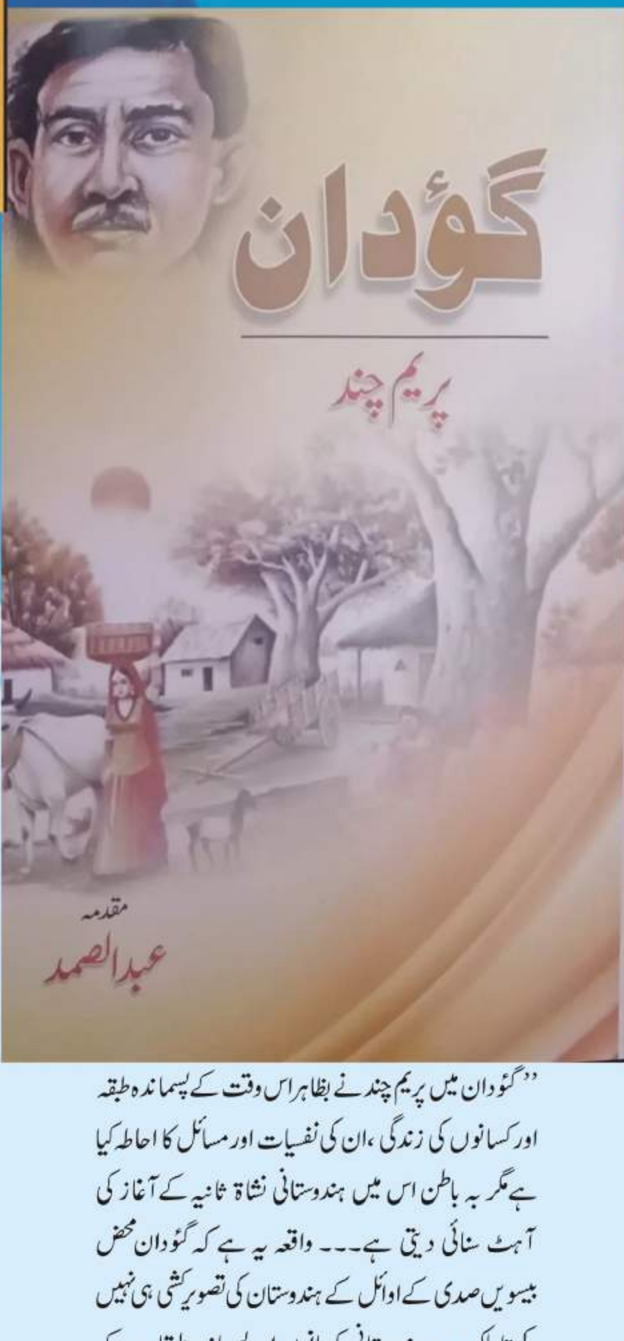

گئودان پریم چند کا آخری مکمل ناول ہے جو 1936 میں بنارس سے ہندی میں شائع ہوااور 1937 میں اس ناول کی اشاعت مکتبہ جامعہ دہلی سے اردو میں ہوئی۔ناول گئودان میں پریم چند نے ہندوستانی کسانوں کے انگریزی نظام حکومت میں ہونے والے سماجی، معاشی اور معاشرتی استحصال کی تصویر کشی کی ہے۔پریم چند نے اپنے اس ضخیم اور شاہکار ناول میں ہندوستانی سماج بالخصوص کسانوں کے معاشی استحصال اور غربت زدہ زندگی کے ان گوشوں کواجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ صرف انگریزوں کے ہندوستانی سماج پر ظالمانہ رویے کے نقوش واضح ہوتے ہیں بلکہ سماج کے ہر طبقے پر برطانوی ظلم وجبر سے پیدا ہونے والی نفسیاتی تبدیلیوں کا احاطہ بھی کیا جا سکتا ہے۔پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں اس وقت کے ہندوستان کی مکمل تصویر دیکھنے کوملتی ہےاوران کی ادبی تخلیقات کا محور وموضوع متوسط طبقہ،غریب کسان اورمزدور رہے ہیں۔ان تمام تر طبقات کی بنیادی ضرورتوں اور معاشی کمزوریوں کے پیش نظر پریم چند نے اپنی تخلیقات میں ان طبقات کی نفسیاتی الجھنوں کا بھی احاطہ کیا ہے۔ناول گئودان کا مقدمہ عبدالصمد نے تحریر کیا ہے۔ ’گئودان‘ ایک مختصر جائزہ میں عبدالصمد لکھتے ہیں:

’’گئودان میں پریم چند نے بظاہر اس وقت کے پسماندہ طبقہ اور کسانوں کی زندگی، ان کی نفسیات اور مسائل کا احاطہ کیا ہے مگر بہ باطن اس میں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے آغاز کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ گئودان محض بیسویں صدی کے اوائل کے ہندوستان کی تصویر کشی ہی نہیں کرتا بلکہ جدید ہندوستانی کسانوں اور پسماندہ طبقات کے گوناگوں مسائل کو سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتا ہے۔‘‘

(گئودان از پریم چند مقدمہ عبدالصمد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2020۔ص 5)

گئودان نہ صرف ہندوستانی کسانوں کی زندگی کا مکمل عکاس ہے بلکہ اس ناول میں عورتوں کی کسمپرسی اور زبوں حالی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔گئودان کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے سے پہلے ناول کے نسوانی کرداروں سے آشنائی قارئین کے لیے ضروری ہے۔نسوانی کرداروں میں پہلا کردار 'دھنیا' کا ہے جو کہ 'ہوری' کی بیوی ہے۔اس کے بعد 'سونا' اور 'روپا' کا کردار ہے جو 'ہوری' اور 'دھنیا' کی بڑی اور چھوٹی بیٹی ہیں۔جھنیا' ہوری کے بیٹے گوبر کی بیوی ہے اور 'پنیا' ہوری کے بھائی ہیرا کی بیوی ہے۔گئودان میں ایک نسوانی کردار 'مس مالتی' کا ہے جو پیشے سے لیڈی ڈاکٹر ہے اور ایک کردار 'دولاری سیٹھانی' کا ہے جو کہ مہاجن ہے۔

پریم چند نے 'گئودان' کی شروعاتی سطور میں قارئین کے سامنے ہندوستانی سماج کی صدیوں سے چلی آ رہی روایات کی پاسدار عورت کا تذکرہ کیا ہے جو کہ ایک غریب کسان کی وفادار بیوی ہے اور اپنے شوہر وخاندان کو دنیا کی ہر چیز پر ترجیح دیتی ہے۔اپنے غریب شوہر کی ڈھلتی جوانی اور لا حاصل محنت اسے ہر لمحہ فکر مند رکھتی ہے اور یہی سبب تھا کہ 'دھنیا' اپنی عمر کی چوتھی دہائی میں ہی جسمانی ساخت کے اعتبار سے عمر رسیدہ بزرگ خاتون نظر آنے لگی تھی۔بھوک اور افلاس میں کٹ رہے جوانی کے دنوں میں دھنیا کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ بڑھاپے کے دن کیسے کٹیں گے۔پریشانی کے اس عالم میں وہ اپنے شوہر سے کچھ اس طرح مخاطب ہوتی ہے:

"۔۔۔تمہاری دسا دیکھ دیکھ کر تو میں اور سوکھی جاتی ہوں کہ بھگوان! یہ بڑھاپا کیسے کٹے گا۔کس کے دوارے بھیک مانگیں گے؟" (ایضاً،ص ۔10)

'دھنیا' کو بڑھاپے کی فکر کھائے جا رہی تھی کیونکہ وہ غریب طبقہ کے افراد کو بڑھاپے کی عمر میں کسمپرسی کے حالات سے گزرتا دیکھ چکی تھی۔ مفلسی کی حالت میں دھنیا اور ہوری نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے لیکن اپنی اولاد کو کبھی بھوکا نہ سونے دیا۔سونا اور روپا بھی اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ کھیت کھلیانوں میں اپنا بچپن گزارنے کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں۔ناول گئودان میں ہوری کے بھائی ہیرا کی بیوی 'پنیا' کا کردار 'دھنیا' سے بالکل مختلف ہے۔ پریم چند نے 'پنیا' کی شخصیت کا نقشہ گئودان میں کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

"ہیرا کی عورت کلیوا لے کر کنوئیں پر جا رہی تھی، چودھری کو بانس کاٹتے دیکھ کر گھونگھٹ کے اندر سے بولی" کون بانس کاٹتا ہے یہاں؟ بانس نہ کٹیں گے"۔۔۔یہ عورت اپنے گھر کی مالکہ تھی۔اسی کی مخالفت سے بھائیوں میں علیحدگی ہوئی تھی۔۔۔کلیوا کی ٹوکری سر سے اتار کر بولی "پندرہ روپے میں ہمارے بانس نہ جائیں گے"۔۔۔وہ قریب جا کر چودھری کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی" آدمی کو کیوں بھیج دوں؟ جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو نا! میں نے کہہ دیا کہ میرے بانس نہ کٹیں گے"۔۔۔پنی دھکا کھا کر گر پڑی مگر پھر سنبھلی اور پاؤں سے تلی نکال کر چودھری کے سر، منہ، پیٹھ پر اندھا دھند جمانے لگی۔" (ایضاً،ص۔34۔33)

پریم چند نے پنیا کے کردار کو گئودان میں شامل کر کے سماج کے اس طبقے کی نشاندہی کی ہے جو غربت زدہ زندگی بسر کرنے کے باوجود خود پر ہونے والے زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔پنیا تمام تر معاملات میں اپنی موجودگی اور رضامندی درج کرانے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کی آواز کو کوئی خاص ترجیح نہیں دی جاتی۔ناول 'گئودان' میں گوبر کے دل میں جھنیا سے شادی کرنے کا خیال امڑتا ہے جس پر جھنیا بھی شادی کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے اور اپنے خیالات کچھ یوں بیان کرتی ہے۔

"۔۔۔میں تو جس کی ہو جاؤں گی اس کی جنم بھر کے لیے ہو جاؤں گی، سکھ میں، دکھ میں، سمپت میں، بپت میں اسی کے ساتھ رہوں گی۔" (ایضاً،ص۔52)

'جھنیا' کا کردار ہندوستانی عورت کا وہ روپ ہے جو اپنے خاوند کو دیوتا مانتی ہے اور زندگی کے پیچ وخم میں اس کا مکمل ساتھ دیتی ہے۔اسی طرح 'گوبر' جب مزدوری کرنے لکھنو شہر چلا جاتا ہے تو 'ہوری' اور اس کا پورا خاندان کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرتا ہے لیکن گوبر کے شہر سے واپس لوٹنے پر جو خوشی دھنیا، سونا، روپا اور جھنیا کو ہوتی ہے وہ قابل رشک ہے۔گوبر کو واپس گھر آتا دیکھ کر جیسے وہ اپنے سارے دکھ درد بھول گئے ہوں۔پریم چند نے اس منظر کو 'گئودان' میں اس طرح پیش کیا ہے۔

"۔۔۔روپا نے کہا بھیا آئے، بھیا آئے اور تالیاں بجاتی ہوئی دوڑی۔سونا بھی دو تین قدم آگے بڑھی مگر اپنی خوشی کو ضبط کر گئی۔۔۔جھنیا بھی گھونگھٹ نکالے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔۔۔دھنیا گھر کا حال سنا کر اسے رنجیدہ نہ کرنا چاہتی تھی، بولی کچھ نہیں ہے بیٹا۔۔۔تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔" (ایضاً،ص۔212)

بیوی کے ایثار، بہنوں کے پیار اور ماں کی ممتا کے ان مناظر کی تصویر کشی پریم چند نے گئودان میں پیش کی ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ گئودان میں مس مالتی کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ مالتی ایک پڑھی لکھی، آزاد خیال عورت ہے جو سماجی بندشوں سے آزاد زندگی گزارنے کی خواہش رکھتی ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ وفکر اور رجحانات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ مس مالتی کی شخصیت اور سوچ میں رونما ہونے والی تبدیلی کو ان سطور میں سمجھا جا سکتا ہے:

''۔۔۔دنیا کو تم جیسے مرتاضوں کی ضرورت ہے جو اپنے دل کو اتنا وسیع بنا دیں کہ ساری دنیا ان کی اپنی ہو جائے۔ دنیا میں بے انصافی کی ظلم کی اور خوف کی دہائی مچی ہوئی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا، مذہبی مکاری کا اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ تم نے وہ پکار سنی۔ تم بھی نہ سنو گے تو سننے والے آئیں گے کہاں سے!۔۔۔اپنے علم اور اپنی عقل کو، اپنی بیدار انسانیت کو زیادہ حوصلہ اور زور کے ساتھ اسی راستے پر لے جاؤ۔ میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔'' (ایضاً ص۔348)

ناول گئودان میں سونا اور روپا کا کردار ہندوستانی سماج کی ان لڑکیوں کی عکاسی کرتا ہے جو اپنی نجی زندگی کے تمام تر معاملات اپنے والدین کو سونپ دیتی ہیں اور ان کے فیصلوں پر سرِ خم تسلیم کرتی ہیں۔ سونا اور روپا کی شادی بھی ادھیڑ عمر مردوں سے ہوئی تھی لیکن وہ اپنی شادی شدہ زندگی کو خوشی سے نبھائے جا رہی تھیں۔ روپا کی شادی رام سیوک سے ہوئی جس کی پہلی بیوی کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا اور وہ روپا کے باپ کا ہم عمر تھا۔ اس سب کے باوجود 'روپا' رام سیوک کے ساتھ خوش تھی اور اس کے دل میں یہی ارمان امڑ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو سکھی دیکھے۔ پریم چند نے روپا کی اس خواہش کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے۔

''۔۔۔اور اس کی سب سے بڑی خواہش تھی اپنے گھر والوں کو سکھی دیکھنا۔ ان کی غریبی کیسے دور کر دے؟ اس گائے کی یاد ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی جو مہمان کی طرح آئی تھی اور سب کو روتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔۔۔مگر وہ جانتی تھی کہ آج بھی ہوری کے دل میں وہ خواہش اتنی ہی تازہ ہے۔ اب کے وہ جائے گی تو وہ اپنے ساتھ وہ دھوری گائے ضرور لیتی جائے گی۔ نہیں، وہ نوکر سے کیوں نہ بھجوا دے۔ رام سیوک سے پوچھنے بھر کی دیر تھی۔ منظوری ہو گئی اور دوسرے دن ایک اہیر کی معرفت 'روپا' نے گائے بھیج دی۔ اہیر سے کہا کہ دادا سے کہہ دینا 'منگل' کے دودھ پینے کے لئے گائے بھیجی ہے۔'' (ایضاً ص۔364)

پریم چند نے ناول گئودان کے آخر میں ہوری کی موت کے منظر کو پیش کر کے سماج کے ہر ذی شعور اور حساس طبیعت انسان کی روح کو جھنجوڑا ہے۔ اس موقع پر بھی 'ہوری' کی بیوی 'دھنیا' کا کردار سماج کی اس ذی شعور عورت کی عکاسی کرتا ہے جو زندگی کے پیچ وخم کے ساتھ موت کی تلخیوں کا سامنا کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ 'دھنیا' اپنے شوہر 'ہوری' کو عالمِ نزع کی حالت میں دیکھتی ہے تو فوراً اس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اب ہوری کی موت قریب ہے۔ اس دل دوز منظر کو پریم چند نے اس طرح بیان کیا ہے:

''دھنیا نے ہوری کا بدن چھوا تو اس کا دل دھڑک اٹھا، چہرہ اتر گیا، کانپتی ہوئی آواز میں بولی، کیسا جی ہے تمہارا؟۔۔۔ دھنیا نے موت کی صورت دیکھی تھی۔ اسے پہچانتی تھی۔ اسے دبے پاؤں بھی آتے دیکھا تھا اور آندھی کی طرح بھی آتے دیکھا تھا۔۔۔سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا امید کے مٹتے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔۔۔دھنیا مشین کی طرح اٹھی۔ آج جو سُتلی بیچی تھی اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی'' مہراج! گھر میں نہ گائے ہے، نہ بچھیا، نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں۔ یہی ان کا گئودان ہے!'' (ایضاً ص۔68-367)

قدرت نے عورت کی جسمانی ساخت کو مرد کے مقابلے میں مختلف بنایا ہے لیکن عورت کے اندر احساسات وایثار کا جذبہ بہ نسبت مرد کے زیادہ رکھا ہے۔ پریم چند نے ناول 'گئودان' میں تمام تر نسوانی کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ اس سے نہ صرف ہندوستانی سماج میں عورتوں کی قدیم تہذیبی روایات کا پتہ چلتا ہے بلکہ خواتین کے ایثار، محبت اور وفاداری کے نقوش بھی عیاں ہوتے ہیں جو ان کی نفسیات کے بنیادی پہلو ہیں۔

□□□

Abaid Ur Rehman Naseer
Research Scholar
Department Of Urdu
University Of Delhi
Delhi-110007
abaid9001@gmail.com

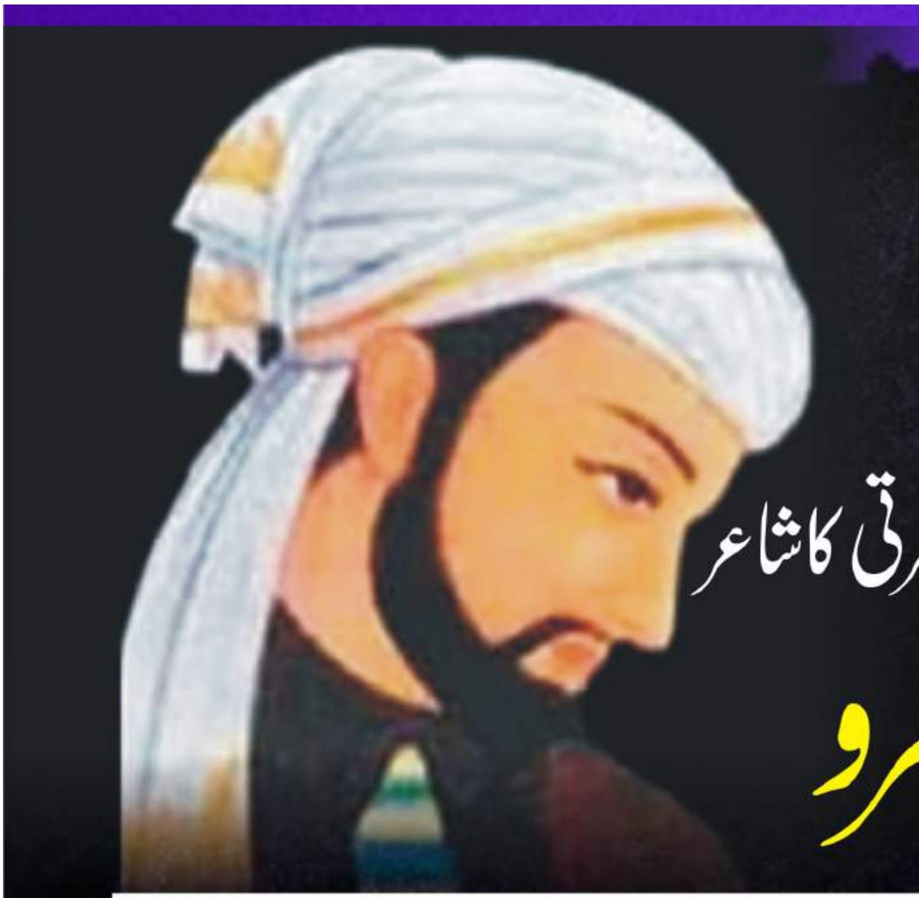

ڈاکٹر اسماء مسعود

اپنی تہذیب اور دھرتی کا شاعر

امیر خسرو

ہماری تہذیب نے ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد موجودہ رنگ روپ اختیار کیا ہے۔اس کے دامن میں دراوڑ، آریہ، بودھ مت، جین مت متانتر وں، اسلام اور عیسائیت کے تصورات اور مت منشانتر وں کی خوشبو ہے۔وہ تہذیب جس کے سفر کا آغاز سندھو سبھیتا سے ہوا تھا عہد بہ عہد سفر طے کرتی ہوئی آج مشترکہ تہذیب کی وہ شکل اختیار کر چکی ہے جس میں مختلف مذاہب، رسم و رواج، عقائد، لوک روایتوں، بولیوں اور زبانوں کے رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں اسی زبان میں نظام الدین اولیاء، بابا فرید گنج شکر، خواجہ معین الدین چشتی، کبیر، نانک، میرا، ملک محمد جائسی، رسکھان تلسی داس اور دادو وغیرہ نے انسانیت اور انسان دوستی کے سبق پڑھائے۔ اسلام کی آمد اور ہندو مسلم اتحاد نے عوام کی ایک گری پڑی زبان کو نکھار کر ایک ٹکسالی زبان بنا دیا۔ ہریانوی، برج بھاشا، پنجابی، اودھی، راجستھانی اور عربی فارسی کی صحبتوں سے اس کی اپنی ایک نئی شکل بن گئی۔آج یہ دنیا کی مقبول، شیریں اور تہذیب یافتہ زبان ہے۔جس نے دنیا کو میر، غالب، اقبال، جوش، فراق، فیض، ناصر کاظمی اور احمد فراز جیسے شہرت یافتہ شاعر دیئے۔وہ اردو جو ہندوستان کی سرزمین سے تعلق کی بنا پر ابتدا میں ہندی، ہندوی، ہندوستانی، گجری اور دکنی کے نام سے شہرت حاصل کرتی ہے، وہ اردو آج اپنے دامن میں مشترکہ تہذیب کا سرمایہ سمیٹے ہوئے ہے۔امیر خسرو اس مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھانے والوں میں سرِ فہرست ہیں۔ یہ امیر خسرو ہی تھے جنھوں نے ابتدائی زمانے میں عوام کی گری پڑی زبان کو شاعری کا لباس پہنایا اور فارسی پسندی کے زمانے میں اپنی دھرتی اور اپنی تہذیب کی خوشبو اس میں سمو کر ہماری زبان کو اس راستے پر ڈال دیا کہ وہ جمہوریت کی پاسبان اور ہندو مسلم اتحاد کی امین بن گئی۔

فارسی کے عظیم شاعر اور ہندوی اردو کے نقاشِ اول امیر خسرو ایک عظیم صوفی اور موسیقی داں تھے۔اگر چہ ان کا اصل سرمایہ فارسی میں ہے لیکن انھوں نے عام بول چال کی زبان کھڑی بولی میں شاعری کر کے ہندوستان کی اس بولی کو زندہ و جاوید کر دیا جسے ان کے زمانے میں ہندوی اور جسے آج اردو کہا جاتا ہے۔امیر خسرو کے تیسرے دیوان ''غرۃ الکمال'' میں اس بات کے سب سے زیادہ ثبوت ملتے ہیں کہ انھوں نے ہندوی میں شعر کہے۔ان کے والد ترک اور ماں ہندوستانی نسل سے تھیں۔

(امیر خسرو: ڈاکٹر وحید مرزا الہٰ آباد 1949، صفحہ نمبر 26)

امیر خسرو آٹھ سال کے تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس کے بعد ان کے نانا عماد الملک نے ان کی پرورش کی۔ ہندوی انھیں اپنی والدہ اور نانا سے ورثے میں ملی تھی۔ ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اپنی مثنوی ''نُہ سپہر'' میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن''

امیر خسرو نے پانچ بادشاہوں کے سیاسی عروج و زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کلام میں اس دور کی تہذیب و معاشرت، سیاسی عروج و زوال، تعمیری سرگرمیاں یہاں تک کہ ہندوستان کے چرند پرند، پھل پھول

اور فکر و فلسفے کو اس طرح سمو دیا کہ ان کا کلام 13 ویں اور 14 ویں صدی کے ہندوستان کی زندگی کا اہم دستاویز بن گیا۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ علاؤالدین کے دورِ حکومت کی یادگار ہے ان کی ایک تاریخی کتاب ''خزائن الفتوح'' جسے تاریخ علائی بھی کہتے ہیں میں انھوں نے علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت، بادشاہوں کی فتوحات، دلی شہر کی خوبصورتی، وہاں کی عمارتوں اور مسجدوں کی خوبصورتی کو سراہا ہے۔ اسی طرح ''غرۃ الکمال'' (تیسرا دیوان) کے دیباچے میں وہ مور، طوطا، شارک، زاغ اور ہندوستان میں پائے جانے والے دوسرے پرندوں کی کھل کر تعریف کرتے ہیں:
اس سلسلے کا ایک شعر دیکھیے:

طوطی ازیں جاست یکے جانوری
ہمچو دگر جانوراں نی بشری

(دیباچہ: ''غرۃ الکمال'' بحوالہ امیر خسرو۔ وحید مرزا، صفحہ نمبر 62)

خسرو کے کلام کے اس پہلو پر بات کرتے ہوئے کرشن بھاؤک نے لکھا ہے کہ:

''امیر خسرو نے تمام ہندوستان میں دستیاب ہونے والے طائروں کی ازحد تعریفیں کی ہیں۔ مور (جسے خسرو نے ہی سب سے پہلے قومی پرندہ اعلان کیا تھا) یہاں ایک عروسِ نو کی مانند حسن رکھتا ہے۔ یہاں ایک سفید آبی پرندہ ''بگلا'' بھی قلیل سی تربیت کے بعد حیرت انگیز کرتب دکھایا کرتا ہے۔ انھوں نے ہی اس طنزیہ لہجے میں اس سفید پرندے کو ''بھگت'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ آگے چل کر ظاہراً نیک و شریف لیکن باطن میں دغاباز شخص کے معنی میں ''بگلا بھگت'' ایک ضرب المثال رائج ہو گیا''

(مضمون: ''امیر خسرو: شیریں زبان اور رنگین بیان شاعر'' کرشن بھاؤک۔ ماہنامہ اردو دنیا، NCPUL، دلی مارچ 2014 صفحہ 18)

مثنوی ''قرآن السعدین'' میں امیر خسرو کے زمانے کی زندگی کی چھوٹی بڑی حقیقتیں موجود ہیں مثنوی میں امیر خسرو کے وطن پرستی کے جذبے کے اظہار میں یہاں کی آب و ہوا پھل پھول اور یہاں کی عمارتوں کی خوبصورتی کو سراہا ہے ساتھ ہی ہندوی کے الفاظ کو فارسی کے ساتھ کامیابی کے ساتھ کھپا دیا ہے۔ اپنے وطن کی سوندھی مٹی کی خوشبو کو سمونے کی جو روایت اردو کے شعراء مثلاً قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی، شاہ عالم آفتاب، اکبر الہ آبادی، اقبال، سودا اور انیس و دبیر کے مراثی اور اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، چکبست لکھنوی، ندا فاضلی وغیرہ کے یہاں پروان چڑھی اس کی بنیاد ڈالنے والے امیر خسرو ہی تھے۔

خسرو کی مثنوی ''دیول رانی وخضر خاں'' میں ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وتمدن اور رسم و رواج کی معلومات موجود ہے پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے چمپا کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

مگر آں رائے چمپا شاہِ گلہا
کہ بوئے مشکبار آمد چو ملہا
چوں معشوق سمن برناز پرورد
ولے رنگش چو روئے عاشقاں زرد
چو پیکانِ زرد بدریدہ آسان

(بحوالہ: ''امیر خسرو! عہد فن اور شخصیت'' عرش ملسیانی۔ صفحہ 67-66)

مثنوی ''دیول رانی وخضر خاں'' میں ہی خسرو نے پان کی تعریف اس طرح کی ہے۔

خراسانے کہ ہندی گیروش گول
نسے باشد بہ نذدش برگِ تنبول
ثنا سد آں کہ مرد زندگانی ست
کہ ذوقِ برق خالیٔ ذوقِ جانیست

(ایضاً، صفحہ 65)

خسرو کا اصل شعری سرمایہ فارسی میں ہے لیکن انھوں نے اردو (ہندوی) میں بھی لکھا ہے۔ اس کی تائید ان کے دیوان ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں ان کا یہ بیان ہے۔

''جزوے چند نظم ہندوی نیز نذرِ دوستاں کردہ شدہ است''

(ایضاً، صفحہ 62)

فارسی کے عظیم شاعر کا اپنے ملک کی عوامی زبان میں لکھنا اپنی زمین اور اپنی زبان سے محبت کا اظہار بھی ہے۔ خسرو کا ہندوی کلام مولانا رشید احمد صاحب سالم اور مولانا محمد امین صاحب چریا کوٹی نے خسرو کے گیت، دوہے، پہیلیاں، خالق باری، دو سخنے وغیرہ جامع تبصرے کے ساتھ ''جواہر خسروی'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ لیکن آج خسرو کا جتنا کلام ہم تک پہنچا ہے اسے مکمل طور پر خسرو کا کلام مان لیا جائے اس پر محققین اور مورخین متفق نہیں ہیں۔ خصوصاً محمود شیرانی، رشید حسن خاں، ممتاز حسین، قاضی عبد الودود اور گیان چند جین نے اس سلسلے میں شک کا اظہار کیا ہے۔

خسرو کے ہندوی کلام پر شک کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ جو ہندوی سرمایہ ان کا ہم تک پہنچا ہے وہ ان کے زمانے کے مخطوطات کے بجائے بعد کی بیاضوں کے ذریعہ آیا۔ درمیان کا ایک بڑا وقفہ اس سلسلے میں

ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔لہٰذا درمیانی کڑیوں کے نہ ملنے کی وجہ سے جدید تحقیق نے امیر خسرو کے بہت سے کلام کو رد کر دیا۔دوسرا سبب یہ ہے کہ امیر خسرو کے ہندوی کلام میں زیادہ تر کلام ایسا ہے جس کی زبان ان کے عہد کی تعمیری زبان سے میل کھانے کے بجائے بعد کی ترقی یافتہ زبان کی نمائندگی کرتی ہے۔اس سے احساس ہوتا ہے کہ ہم تک آنے والے خسرو کے کلام میں مکمل طور پر زبان کا وہ رنگ نہیں ہے جو ان کے عہد میں تھا، دراصل اپنی مقبولیت کی وجہ سے خسرو کا بہت سا ہندوی کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا اور سات صدیوں میں وہ ہماری لوک روایت کا حصہ بن گیا، لاکھوں کروڑوں لوگوں کی زبان پر چڑھنے سے ہوسکتا ہے اس میں کچھ تبدیلی آگئی ہو لیکن سارا کلام اس بنیاد پر رد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

''جذوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است''

یعنی اپنے ہندوی کلام میں سے میں نے کچھ کلام دوستوں کی نذر کردیا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ امیر خسرو نے فارسی کے علاوہ ہندوی اردو میں بھی لکھا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے فارسی کلام کی طرح اپنے ہندوی اردو کلام کو جمع نہیں کیا۔ہمیں پرانی کتابوں اور بیاضوں میں اس کے نمونے ملتے ہیں۔

مثلاً ملاّ وجہی کی ''سب رس'' میں امیر خسرو کا ایک دوہا یوں ملتا ہے:

پنکھا ہوکر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

اس دوہے میں، ڈلی، تیرا، جلتی، لیا اور تیرے یہ سب کھڑی بولی کی نشاندہی کرتے ہیں جس پر اردو کی بنیاد ہے۔میر تقی میر کے ''نکات الشعراء'' میں خسرو کا یہ ریختہ ملتا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارہ — کچھ گھڑئے سنوارئے پکارا
نقدِ دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

یہاں ایک مصرع کھڑی بولی اور ایک مصرع فارسی میں ہے جو کئی مقامات پر امیر خسرو کا طریقہ رہا ہے۔''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں خسرو کا یہ ہندوی کلام بھی ملتا ہے۔

آری آری ہمہ بیاری آری
ماری ماری برہ کہ ماری آری

حالانکہ جمیل جالبی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خسرو کے اس کلام میں امتدادِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں ہوچکی ہیں کہ اسے مستند نہیں مانا جاسکتا لیکن:

''ان اشعار ریختہ کو پڑھ کر زبان و بیان کے لہجے' آہنگ' طرزِ ادا اور ساخت سے واضح طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دو کلچر ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں اور اس امتزاج سے ایک تیسرے کلچر کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔اردو زبان کے خدوخال بھی اس کے ساتھ ساتھ اجاگر ہوتے ہیں اور یہ زبان اس ترقی پذیر تیسرے کلچر کی ترجمان بن جاتی ہے۔ان اشعار کی تاریخی و لسانی اہمیت یہ ہے کہ ان سے اس دور کی زبان کے کینڈے رنگ روپ اور رواج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

(''تاریخ ادبِ اُردو'' جلد اول آغاز سے 1750 تک۔ڈاکٹر جمیل جالبی، صفحہ 29، ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس دلی طبع پنجم 1993)

جدید تحقیق نے خسرو کے ہندوی کلام سے متعلق بہت سے سوالات اٹھائے اور آج ان کا تمام ہندوی کلام اسی صورت میں تسلیم کرنے میں دشواریاں حائل ہیں۔مثلاً خسرو سے منسوب یہ ریختہ:

''زرگر پسرے چو ماہ پارہ''

کے بعد کے مصرعوں کی صاف اور رواں زبان خسرو کے عہد کی 13 ویں اور 14 ویں صدی کی زبان سے کسی بھی طرح میل نہیں کھاتی۔

امیر خسرو سے وابستہ ایک روایت کے مطابق امیر خسرو نے اپنے پیرو مرشد نظام الدین اولیاء کے انتقال کی دردناک خبر سن کر یہ دوہا کہا:

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپ نے رین بھئی چھوں دیس

یہاں ڈارے اور بھئی کے علاوہ باقی دوہا کھڑی بولی کا ہے۔قائم چاند پوری کا تزکرہ مخزنِ نکات میں امیر خسرو کی ایک غزل ہمیں ملتی ہے جس کا مطلع ہے۔

ز حالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نلیہو گاہے لگائے چھتیاں

حالانکہ پروفیسر محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود نے خسرو کی اس غزل کو ان کی غزل ماننے سے انکار کرتے ہوئے دلیل دی ہے کہ یہ غزل جس وزن میں ہے یہ وزن خسرو کے زمانے میں رائج نہیں تھا۔ابتدائی غزلیں یا ریختے سیدھے سادے اوزان میں ملتے ہیں۔اس طرح کا پختہ طویل وزن خسرو کے عہد کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی نظر نہیں آتا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ خسرو کے کلام کے تئیں ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''روایتاً جو ہندوی کلام امیر خسرو سے منسوب رہا ہے اسے

یکسر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد امین عباسی چریا کوٹی نے امیر خسرو کے ہندوی کلام کو مرتب کرتے ہوئے صرف دوسروں کے بھیجے ہوئے میٹیریل پر اکتفا کی اور قلمی نسخوں کی تلاش میں مطلق کوئی کوشش نہ کی۔ ضرورت ہے کہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں جو قلمی نسخے تھے اور جن کا ذکر اسپرنگر نے کیا ہے انہیں تلاش کیا جائے یا ان سے پہلے کا کوئی قلمی نسخہ مل جائے تو امیر خسرو کے ہندوی کلام کی از سر نو تدوین کی جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسے کسی دستاویز کی غیر موجودگی میں بھی امیر خسرو کی فارسی تصانیف میں اور ان سے منسوب ہندوی کلام کے بعض حصوں میں ایسی مضبوط تاریخی اور لسانی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کی بنا پر امیر خسرو کو ''دہلوی ہندوی'' کا نقاشِ اول کہا جا سکتا ہے''

(مضمون ''ہندوی کا نقاشِ اول :امیر خسروؔ'' گوپی چند نارنگ ۔ ماہنامہ اُردو دنیا'' دلی مارچ 2014،صفحہ 16)

امیر خسرو کی ہندوی شاعری کا اولین تعارف ایک یوروپین ڈاکٹر اے اسپرنگر A Sprenger نے کرایا۔ انھوں نے 1852 اور 1854 میں امیر خسرو کے ہندوی کلام سے متعلق دو مضامین لکھے۔ ان میں امیر خسرو کی چھ پہیلیاں، غزل اور ریختہ کے نمونے موجود ہیں۔ اسپرنگر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ اس نے شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں امیر خسرو کے ہندوی کلام کے قلمی نسخوں سے نقل کیے ہیں۔ اسپرنگر پیشے سے ڈاکٹر تھا، وہ عربی فارسی اور عبرانی زبانیں جانتا تھا۔ اس کا تعلق جرمنی سے تھا اور ایم ڈی کی ڈگری لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوا۔ اسپرنگر 1845 سے 1847 تک دو سال دلی کالج کا پرنسپل بھی رہا۔ 1847 میں وہ لارڈ ہارڈنگ کے حکم پر اودھ کے شاہی کتب خانوں کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے کی ذمہ داری پر لگایا گیا۔ یہیں اس نے امیر خسرو کے ہندوی کلام کے نسخوں کو دیکھا۔ ان پر مضامین لکھے، کیٹلاگ تیار کیا اور کلام کا کچھ حصہ نقل بھی کیا۔ ڈاکٹر شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب ''اردو ئے قدیم'' 1925 میں ڈاکٹر اسپرنگر کے 1854 والے مضمون سے امیر خسرو کی چھ پہیلیوں کو نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کے ہندوی کلام کے ان نسخوں کی تلاش کی جن کے بارے میں اسپرنگر نے اپنے 1852 کے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ یہ شاہانِ اودھ کے توپخانے والے کتب خانے کے قلمی نسخوں میں سے نقل کئے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو برلن کی لائبریری میں اسپرنگر کے اس ذخیرے کا علم ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''اسپرنگر کے مخطوطات کا بہت بڑا حصہ مغربی برلن میں محفوظ ہے۔ 1983 کے سفرِ یوروپ کے دوران راقم الحروف کو اس نادر ذخیرے کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ کتابیات اسپرنگر 1763 کے تحت ایک مجلد میں چار چھوٹے چھوٹے قلمی نسخے ایک ساتھ بندھے ملتے ہیں۔ سرخ چرمی جلد پر بیل دار ڈیزائن بنا ہوا ہے۔ جلد قدرے کرم خوردہ ہے۔ دیسی کاغذ پر متن سیاہ روشنائی میں لکھا ہوا ہے۔ بیچ بیچ میں عنوانات سرخ روشنائی سے درج کئے گئے ہیں۔ تعداد اوراق کل 138 ہے۔''

(''امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر'' گوپی چند نارنگ ،صفحہ 104-103)

امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ، شکاگو، 1987

اسی میں چار رسالے ایک ساتھ بندھے ہیں ان میں ہی ایک رسالہ ''پہیلی ہائے ہندی'' ہے جس میں امیر خسرو کی 150 پہیلیاں ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اسپرنگر کے ذخیرے میں امیر خسرو کے ہندوی کلام (جو برلن لائبریری میں ہے) کو نسخہ برلن کا نام دیا۔ ہم یہاں گوپی چند نارنگ کی تصنیف ''امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر'' میں سے امیر خسرو کی چند پہیلیاں یہاں نقل کرتے ہیں۔

حمدِ الٰہی

سب کوئی اس کو جانے ہے ــــ پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں لیکھا ہے ــــ فکر کیا اون دیکھا ہے

(ایضاً،ص:53)

خربُزہ

دس ناری کا ایک ہی نر ــــ بستی باہر و اکا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم ــــ منھ میٹھا تا شیر گرم

(ایضاً،ص:53)

نعت

ایک پرکھ ہے دیٔ سنوارا ــــ دنیا کا نستارن ہارا
واکے چرنوں لاگ رہو ــــ زیادہ بچن نہ منہ سے کہو

(ایضاً،ص:54)

چراغ

بالا تھا جب سب کو بھایا ــــ بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں ــــ بوجھے نہیں تو چھوڑو گاؤں

(ایضاً،ص:52)

بڑے کا گھونسلا

ایک انوکھا گرہ بنایا   اوپر نیو نیچے گھر چھایا
بانس نہ بلی بندھن گھنے   کہوخسرو گھر کیسے بنے

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اسپرنگر کے 1852 والے مضمون میں سے اسپرنگر کا ایک بیان نقل کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:۔

"I take this opportunity of adding some specimens of early Rekhta poetry.Qayim says that Amyr Khusrow has written Rekhta verses and that he is the author of Rekhta Logogriphs.he quoted two verses and no Riddles.I give one of the verses quoted by Qayim and the whole ghazal from which the other verse is taken and some specimens of Riddles though it is certain of that nine tenths of the Riddles ascribed to him are much more recent date"

یعنی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے 10 میں سے 9 بعد کے زمانے کی ہوں غرض اسپرنگر بھی امیر خسرو کی تمام پہیلیوں کو اصلی نہیں مانتا لیکن یہ سچ ہے کہ ''اگر ان میں 10 فیصد پہیلیاں بھی اصلی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس سے کم اصلی ہوں یا اس سے زیادہ اصلی ہوں یعنی 150 پہیلیوں میں سخت سے سخت اندازے کے مطابق اگر صرف 15 پہیلیاں بھی اصلی ہوں تو جب تک ہمیں معلوم نہیں کہ وہ ۱۵ پہیلیاں کون سی ہیں، اس سرمایے کی حفاظت نہ صرف ہمارا انسانی وادبی فرض ہے، ثقافتی فرض بھی ہے، کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو جس طرح دوسرے ذرائع نیست و نابود ہوگئے یا دوسرے قلمی نسخے برباد ہوگئے اور ان میں سے باوجود سعی وجستجو کے آج تک ایک نسخہ بھی ہاتھ نہیں آیا، یہ نسخہ بھی ہماری بے توجہی کا شکار ہوسکتا ہے''

(ایضاً،صفحہ 116)

امیر خسرو کے ہندوی کلام پر کتنا بھی شک کیوں نہ کیا جائے یہ بات سب نے تسلیم کی ہے کہ امیر خسرو نے فارسی کے علاوہ ہندوی زبان میں بھی لکھا ہے۔ان کے کلام سے ہمیں ان کے دور کی تعمیری زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔امیر خسرو کے ہندوی کلام کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ تاریخی اور لسانی اعتبار سے ہم ان کے اشعار میں اس دور کی زبان کے رنگ وروپ کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس دور کے عوامی کلچر کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

امیر خسرو اپنی فارسی ''مثنوی نہ سپہر'' میں ہندوستان کو اپنا ''مولد و ماویٰ وطن'' کہتے ہیں اور اپنے وطن سے محبت اور ہندوی میں لکھنے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے ہندوی میں شاعری کی ہے۔ان کی پہیلیاں اپنے دور کی عوامی زندگی اور اسکی تہذیبی حقیقتوں کی ترجمان ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے صحیح لکھا ہے:۔

''امیر خسرو کی ہندوی پہیلیوں کو محض تفریح کی چیز نہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں 13 ویں اور 14 ویں صدی کے برصغیر کی وہ روح بول رہی ہے جو زندگی کو پُر امن اور خوشگوار بنانے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ان چیستانوں میں عوامی انداز کے ہلکے پھلکے اشارے ہیں۔یہاں خسرو کی حیثیت اس شاعر کی نہیں ہے۔جس نے فارسی کے پانچ دیوان لکھے اور بہت سی مثنویاں اور جو اپنی طرز کا بے مثال شاعر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں وہ خسرو موجود ہے جو عام ہندوستانی انسان ہے اور زندگی سے بھرپور ہے اور اس زندگی کی تہذیب کو وہ مختلف شکلوں میں دیکھتا رہتا ہے۔''

(''اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے 1857 تک'' ڈاکٹر تبسم کاشمیری ،صفحہ 37، ایم۔آر پبلی کیشنز۔نئی دلی 2006)

حقیقت یہ ہے کہ زبان وادب اور تہذیب ومعاشرت کی تاریخ میں امیر خسرو کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔انھوں نے نہ صرف اپنے عہد کی عوامی زبان کو شاعری کا لباس پہنایا بلکہ اپنے عہد کی عوامی تہذیب ومعاشرت کی ترجمانی کر کے وہ ایک مشترکہ تہذیب کی بنیاد ڈالنے کا اہم ترین کارنامہ بھی انجام دے گئے۔امیر خسرو کی شاعری اور شخصیت کا عوامی اور ہندوستانی رنگ انہیں اپنی دھرتی اور اپنی تہذیب کا شاعر قرار دیتا ہے۔

□□□

Dr. Asma Masood
Assistant Prof.
Govt. Dungar College
Bikaner-334003(Rajasthan)
Mob: 8209446325
E-mail:asmasood110@gmail.com

بابوجی کی بیٹی منظر و پس منظر

ڈاکٹر نظر امام

بابو جی کی بیٹی اردو کی ممتاز و معروف افسانہ نگار ش، بانو، ادیب کے افسانوں کا ایک جائزہ ہے جسے صبیحہ اطہر نے ترتیب دیا ہے۔ دراصل اردو افسانے کی روایت بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہوئی اور یہ بھی ایک تاریخی صداقت ہے کہ ش، بانو، ادیب تقریباً 1958 سے ہی اپنے سایۂ فکر وفن میں جگہ بناتی رہی۔ یہاں اس بحث کی روایتی تفصیل میں جانا مطلوب نہیں کہ ان کے دور میں لکھنے والے ادیب کس طرح چھپ چھپ کر ادبی تخلیق لکھتے تھے۔ بلکہ یہ اشارہ ہی کافی ہے کہ 1960 کا دور اردو میں افسانہ نگاری کا قیمتی دور تھا۔ اس عہد کا ادب یہاں کے ادیبوں کی وقیع اور تاریخ ساز خدمات سے محروم نہیں رہا۔ ہم علی محمود کی باتیں کریں یا عصمت آپا کی یا سہیل عظیم آبادی کی یا ش، بانو ادیب کی، بہرصورت قدم بہ قدم ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ترقی پسندی کا تحریکی دور ش، بانو، ادیب کا دور تھا۔ اسی وقت واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، عطیہ پروین اور ش، بانو، ادیب کی نئی کھیپ سامنے آنے لگی تو اس میں بھی پہلے دور کی طرح بہر طور مذکورہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات نمایاں رہیں۔ آزادی کے بعد اور خصوصاً بیسویں صدی کی آخری چوتھائی صدی میں ایسے افسانہ نگاروں نے اس صنف کی وقعت میں بے پناہ اضافے کیے جن میں سے بیشتر کا قلم آج بھی رواں دواں ہے۔

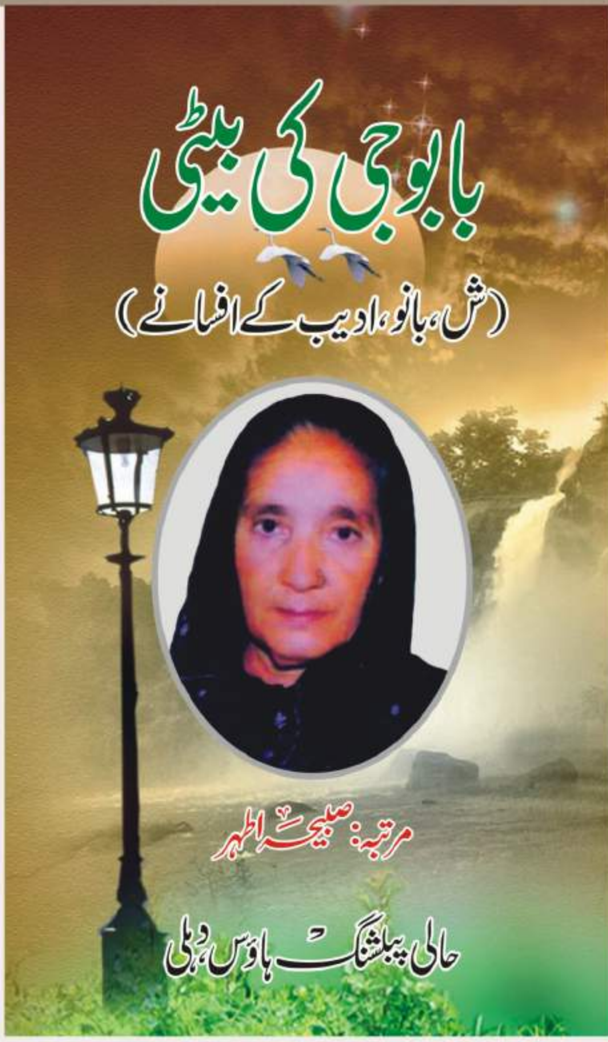

ان کی ریاضتوں اور محنتوں کا صلہ اس طرح مل رہا ہے کہ آج ان کے ناموں سے صرف نظر کر کے ہم فکشن کی تنقید میں دیانت داری کا حق کسی بھی طرح ادا نہیں کر سکتے جنھوں نے تقریباً 60-1958 سے اس میدان میں قدم رکھا اور آج بھی وہ اپنے فن کی جولانیاں دکھانے میں پوری طرح مستند ہیں۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غالباً 1960 سے 1980 کا دور چیلنج کا دور تھا۔ اس کتاب سے متعلق بھی میں عرض کر دوں کہ بابو جی کی بیٹی کوئی علامتی نہیں اور نہ ہی کسی افسانے سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کے والد محترم الحاج بابو محمود حنیف مرحوم با اثر اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ سیاست اور سماج سے ان ان کی وابستگی نزدیک کی تھی۔ وہ اپنے علاقے میں بابو جی کے نام سے مشہور و معروف

تھے۔ش، بانو، ادیب کی پرورش اتر پردیش کے مردم خیز خطہ قصبہ گنگوہ، ضلع سہارنپور، میں ہوئی۔ وہاں دور دور تک ایسی فکر رسا شخصیت موجود نہیں تھی۔ ان کی زود گوئی اور ان کے قلم کی سرعت رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ بات عرض کر دوں کہ وہ بہت ذہین تھیں اور ان کے اندر ایک معتبر و تخلیقی توانا ذہن عمل پیرا تھا۔ ان کے شوہر نامدار اردو کے ممتاز و کہنہ مشق شاعر علامہ نیّر قریشی گنگوہی تھے اور ان کے بڑے صاحب زادے عمران عظیم شعر و ادب میں مشہور و معروف ہیں۔ شاعری، تنقید اور تحقیق میں کئی جہات کی دریافت کی ہے اور دہلی ہائی کورٹ میں سینئر اسٹینڈنگ کونسل ہیں۔

اس ادبی سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے میں ان کے افسانوں کے تجزیے پر آجاؤں۔ ممتا اور ممتا کا آئینہ، یہ بانکپن، یہ سادگی، شعلہ و شبنم، خوش گوار جلوے، غم اور بھی ہیں، ہوا زمانے کی، جشن دیوالی، خونی، ممتا کے متوالے شکار، موت کے پھول، دوسرا رخ، یہ زندگی یہ مرحلے موت کے بعد، دو جسم ایک جان، مرضی مولیٰ کی، تین بلبلے، فنکار، اللہ مالک ہے، جیل یاترا فطرت اور چندا ماما دور کے یہ افسانے ش، بانو، ادیب کا شناخت نامہ ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ افسانے مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ کچھ موضوعات و مسائل کی آج نوعیت کچھ مختلف ہو سکتی ہے جو ایک فطری عمل ہے۔ اس کتاب کی مرتبہ صبیحہ اطہر نے بعنوان ''مختلف زاویوں کی پارکھ افسانہ نگارش، بانو، ادیب'' سے مذکورہ کتاب کی ابتدا کی ہے۔ صبیحہ اطہر لکھتی ہیں:

''ش، بانو، ادیب کے افسانوں میں رنگارنگ مناظر ہیں ان کے یہاں عہد گذشتہ کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ عہد حاضر کی مایوسیاں اور کرب بھی اور عہد آئندہ کے روشن امکانات بھی۔ وہ زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھتی، پرکھتی اور برتتی ہیں۔

چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کریں۔ ان کے افسانوں میں عہد حاضر کے مسائل بھی ہیں، نئے موضوعات بھی اور رومانی افسانوں کے چٹخارے بھی۔

> ''وہ جائے نماز پر بیٹھ کر زار و قطار رو رو کر اللہ تبارک تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ اچانک پوسٹ مین نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ریاض احمد نے لپک کر دروازہ کھولا۔ سامنے پوسٹ مین کھڑا تھا۔ پوسٹ مین نے اسے لاٹری میں نکلا ہوا 45 ہزار روپے کا ڈرافٹ دیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کا اُمڈا ہوا سیلاب بہنے لگا۔
>
> ریاض احمد کو محسوس ہوا کہ اللہ نے اس کی دعا سن لی ہے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اللہ نے بیٹی کی سگائی سے ایک ہفتہ قبل ہی معقول انتظام کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ اپنی مخلوق کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہے۔ جبکہ اس کی مخلوق اسے ضرورت میں ہی یاد کرتی ہے۔'' (اللہ مالک ہے)

ش، بانو، ادیب کے اس افسانے سے معلوم ہوا کہ وہ خوف خدا بھی کھاتی ہیں اور اللہ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ رکھتی ہیں تبھی تو اللہ میاں اپنے سچے بندے کے وقت میں کام آجاتا ہے۔

> ''کچھ دیر کے بعد خوشید عالم نے اکتاہٹ اور گھٹن محسوس کرتے ہوئے تیکھی چتون کے ساتھ اپنے بھائی سے کہا۔ کہ تم برابر والے کمرہ میں چلو میں ابھی ابھی اسی کمرہ میں آرہا ہوں۔ اس کے لہجے میں جیسے روکھا پن تھا اور آنکھوں میں بے رخی تھی۔ اس کے سامنے ایک بزرگ عمر ملازم کھڑا ہوا تھا۔ جو اس کو برابر والے کمرہ میں بٹھا کر چلا گیا۔ اس برابر والے کمرہ میں بھی اس کے بھائی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔
>
> ''وہ کہہ رہا تھا۔ یہ مطلب پرست لوگ نہ جانے کیوں مجھ سے چپکتے نظر آرہے ہیں۔ جن کو میں جانتا اور پہچانتا بھی نہیں ہوں وہ بھی مجھ کو کوئی بھائی اور کوئی مجھ کو اپنا عزیز اور کوئی رشتے بتا کر نہ جانے کیوں ملنے جلنے کے لئے چلے آتے ہیں۔ جب کہ میں انہیں جانتا اور پہچانتا بھی نہیں ہوں۔ عجیب حال ہے اس دور کا''۔ (یہ بانکپن یہ سادگی)

اس افسانے میں وہ اپنے محسن کو بھول جاتا ہے۔ اس نے ہمیشہ ہی اپنے احسان کے بدلے لوگوں کے جور و ستم جھیلے۔ مگر اس کا ہر قدم تعمیری ہوتا تھا۔ وہ اپنی ہر پریشانیوں کو بھول گیا تھا۔ اس نے مصیبت میں زندگی جھیل کر بہن بھائیوں کی زندگی بنا دی تھی وہ صرف اس بات پر شاد و مطمئن تھا۔ ان کی ایک کہانی کا آغاز دیکھیے:

''دیش والو''

> میری کہانی ایک رستا ہوا ناسور ہے، میں ظلمت کے تاریک پردوں میں رہتی ہوں۔ میری آنکھیں جلتے آنسوؤں کا سمندر ہیں۔ آؤ میرے قریب آؤ۔ میری کہانی دیدہ و دل کی گہرائیوں میں سمو کر میرے رنج و غم میں ڈوب جاؤ۔ اس لئے کہ میں بھی تمہارے دیش کی ایک بھکارن ہوں۔ میرا غم پورے دیش کا دل ہلانے والا غم ہے۔ آج میں اپنے ماضی کے سینے کو تار تار کئے دیتی ہوں۔ میں وہ ایک معصوم تصویر تھی

۔جس پر شفق کا گمان ہوتا تھا زندگی گویا حسن کا مرقع تقدیر نے میرے ماتا پتا سے شکوہ گلہ کیا۔ بڑے بڑے شریف ورئیس خاندان کے نوجوانوں نے میرے پیغامات بھیجے۔ سفارشیں کرائیں ۔لیکن میرے ماتا پتا نے ان کی تمام درخواستیں نا منظور کر دیں ۔اور اس مکر وفریب کے چلتے ظالم منوہر جو آج میرا پتی ہے اس کو میر زندگی میری بہاریں سونپ دیں۔''

یہ محض جملوں کی ساخت سے بنائی ایک عبارت (خونی) نہیں ہے بلکہ ایک ہوش مند قلم کار کی عصری حسیت اور ان کا تخلیقی وزن ہے جو عہد حاضر میں ہر عورت کا مقدر ہے۔ ماں ، بہن، بیوی، محبوبہ، طوائف ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہر جگہ ناز یبا حرکت ہوتی ہے۔ ہر جگہ اس کی تذلیل کی گئی۔عورت کی یہ کہانی اور اس کے بیان کا سلیقہ ہی ش، بانو، ادیب کا کمال ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس کہانی کو لکھتے وقت کہانی کار نے اپنے شعور کا دامن سنبھالے رکھا اور لفظوں کے بہانے بہت پتے کی بات کہہ گئی ہیں۔

'دو جسم ایک جان' میں مہوش اور گلفام دیوانگی کی حد تک ایک دوجے میں سما جاتے ہیں کہ وہ بھر دنیا میں کسی ہلچل یا کسی نظارے کو پسند نہیں کرتے۔

''مہوش زوردار لہجے میں بولی۔گلفام میرے اچھے گلفام اگر کوئی بھی ہماری خوشیوں میں آڑے آیا۔تو ہم اس کو ہرگز ہرگز برداشت نہ کریں گے۔ گو ہمارے والدین ہی کیوں نہ ہو۔ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا ذکر ہی کیا۔اس افسانے میں دونوں پیار کے بندھن میں اس قدر بندھ جاتے ہیں کہ وہ کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے۔حالانکہ ماں باپ کی مداخلت بھی انہیں اپنے پیار میں مناسب و معقول نہیں لگتی۔عشق کا اپنا الگ مذہب ہوتا ہے اور الگ دین ۔عشق کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے۔''

اسی طرح ان کی کہانی ''موت کے پھول'' کا دل سوز منظر دیکھیے :

''پھول چونک گیا۔ وہ اس کی جانی پہچانی آواز اس کی بہن رنجنا کی تھی ۔اس کے سامنے رنجنا کا ٹمٹماتا ہوا چہرا جھلملا رہا تھا۔ پھول دم بخود رہ گیا۔آنکھیں پتھرا گئیں۔''

(موت کے پھول)

مذکورہ افسانے کا دل سوز منظر یہ ہے کہ وہ اپنی بہن رنجنا کے ساتھ ناپاک ارادے کی تکمیل کرنے جا رہا تھا۔ یہ جسم کا کاروبار بھی عجیب ہے جو کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔وہ سماج کا بھدّا اور بدداغ چہرہ دیکھ کر لرزنے لگتا ہے۔۔

اسی طرح ایک افسانے ''جشن دیوالی'' بھی عبرت ناک افسانہ ہے۔اس افسانے کا کلیدی حصہ حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

''دیوالی کی وہ رات ہانپتے، کانپتے گزر گئی۔رنجنا جو دیوالی کے چراغوں کی طرح معصوم ومقدس تھی۔ذرا کی ذرا میں لٹ گئی۔ عصمت پارہ پارہ ہوگئی۔ تقدس تار تار ہو گیا۔ وہ سوچ سوچ کر دیوالی کے چراغوں کی لو کے مانند لرز رہی تھی جیسے کہ اس کی زندگی کا تقدس تار تار ہو گیا۔حسن وشباب لٹ گیا ہو۔''

اسی طرح ایک افسانہ ''ممتا اور ممتا کا آئینہ'' ملاحظہ کیجیے۔

''ہرگز ہرگز میری کوئی مانگ نہیں۔آپ کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہئے ۔ فقط مجھے آپ کی ضرورت ہے ۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ہرگز ہرگز کچھ نہیں چاہیے۔ میں آپ کا اور آپ کی نظر کرم کا محتاج ہوں اور محتاج رہوں گا۔ سریتا نے بڑے تپاک سے کھڑے ہو کر اپنی مرمریں سی باہوں میں دلیپ کو جکڑ لیا اور جگ مگ، جگ مگ کرتے ہوئے ماتھے کو چوم لیا۔آج دلیپ بھی اپنی خوش قسمتی پر خندہ زن تھا۔''

اس افسانے میں دلیپ سریتا کی دولت سے مرعوب تھا۔اس نے سریتا سے شادی بغیر جہیز کے لالچ میں کی۔عہد حاضر کے لئے یہ افسانہ عبرت ناک ہے۔

رشوت خوری کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''داروغہ ونے کمار نے سنیل کو ڈراتے ہوئے کہا۔تم اپنی اس جیل یاترا کو تمام عمر بھول نہیں پاؤ گے۔سنیل نے ڈرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اس کی جیب میں گاندھی والی تصویر کے کچھ نوٹ ڈالے تو داروغہ نے ہنستے ہوئے مصلحت بھرے انداز میں کہا۔تم بے قصور ہو میں تمہارے خلاف مقدمہ درج نہیں کر سکتا۔حوالات میں بند ایک شخص کو اپنے پاس بلا کر دو چار مغلظات سے نوازا۔
میں دیکھتا ہوں تمہیں بھی اور تمہارے سفارشی کو بھی۔تمہیں وہ کیسے بچائے گا۔سنیل کے خلاف جو مقدمہ درج ہونا تھا وہ اس شخص کے نام درج کیا اور سنیل کو باعزت رخصت کر دیا۔''

(جیل یاترا)

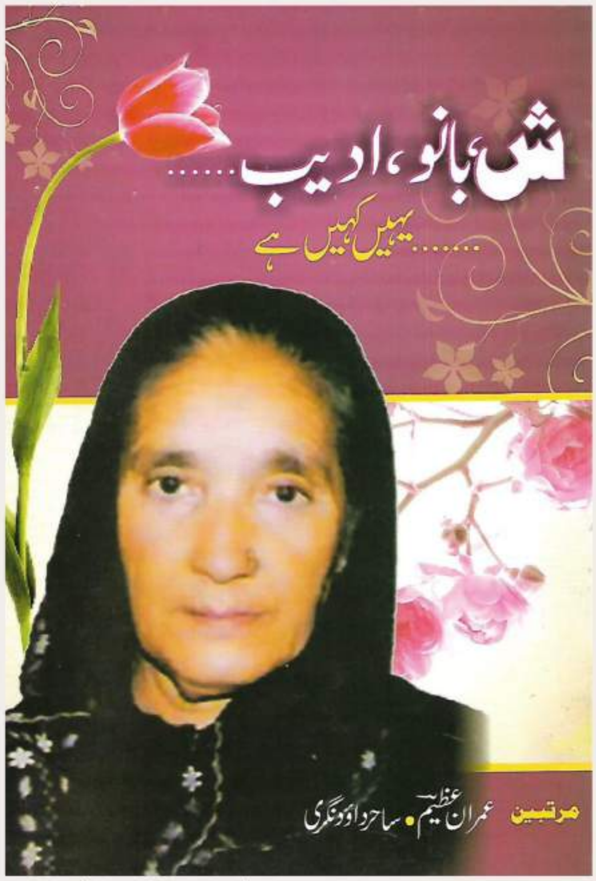

ش، بانو، ادیب نے رشوت خوری کی جو سچی تصویر پیش کی ہے وہ لائق مشاہدہ اور لائق مطالعہ ہے۔

محترمہ کے ایک افسانہ ''شکار'' کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''گلیوں اور پارکوں میں ڈھونڈا ہوٹل اور سنیما کے چہار اطراف کے چکر لگائے مگر کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ پکچر شروع ہوگئی تھی۔ اکرم نے بڑھ کر تین ٹکٹ لے لئے اور سنیما ہال میں گھس گئے۔ ہال میں کرسی تھرتھراتی گئیں جیسے معصوم نرگسی آنکھوں میں ہلکی ہلکی روشنی کانپ رہی ہو۔ ''شکار'' اکرم کے دل کی آواز گونج اٹھی اور اکرم کے سپنوں کے پھول کھلنے لگے۔ دل کی آگ روشن ہونے لگی۔ اس میں خوشبوؤں کی لپٹی مسکراہٹیں تیر رہی تھیں اور اکرم کے ہونٹوں پر لطیف مسرت ہوئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر جیسے بلبلے سے گزر رہے تھے۔ چند لمحوں تک وہ لمس کسی ساز کے مدھم اور میٹھے سروں کی طرح اس کے دل و دماغ میں لرزتا رہا اور جنسی جذبے کی بجائی لہریں مدھم مدھم سانسوں کے جھولے میں بہتی ہوئی کھو گئیں اور اس کا چہرہ لال ہوگیا اور اس کے بعد اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس غیر معمولی حالت سے بے قابو ہو کر لڑکی کا ہاتھ نزاع سے اکرم کے گال پر پڑا اکرم اپنے گال کو سہلا رہا تھا۔ کہ انٹرول ہوگیا اور لڑکی نے نقاب الٹ کر دیکھا تو وہ ششدر رہ گئی۔ اس کے سامنے اس کا بھائی اکرم بے حس و حرکت کھڑا اب بھی اپنا گال سہلا رہا تھا۔''

مذکورہ افسانے میں اکرم اور رجبا ساتھ ساتھ ہیں۔ اسے دن بھر کوئی شکار نہیں ملا تو اس نے پھٹا پھٹ ٹکٹ خریدے۔ انٹرول میں پتہ چلا کہ وہ کوئی شکار نہیں اس کی بہن رجبا تھی۔ اکرم اس منظر پر حیران اور پشیمان ہوا۔

ش، بانو، ادیب کے تمام افسانے کامیاب ہیں۔ انھوں نے افسانے اس دور میں لکھے جب چھپ چھپ کر خواتین اردو ادب کی خدمت کرتی تھیں۔ وہ اتر پردیش کے قصبہ گنگوہ (ضلع سہارنپور) جیسی جگہ پر قیام کر کے اردو ادب کے لیے اتنا بڑا کام کر رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان کی سسرال کا گھرانا ادبی تھا۔ ویسے بھی ادبی، علمی اور ثقافتی سرگرمی ضبط تحریر میں آجاتی ہے تو اس کی حرارت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہی دلچسپی کا شغف محترمہ ش، بانو، ادیب کے ساتھ ہوا۔ اس طرح کی حرکت میں برکت ہو جاتی ہے۔ ش، بانو، ادیب واقعی مبارک باد کی مستحق ہیں کہ اس کام کے لیے انھیں کافی پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ تب جا کر صبیحہ اطہر نے ان کے افسانوں کو یکجا کر کے ان کے انتقال کے بعد ''بابو جی کی بیٹی'' کے نام سے افسانوی مجموعہ ترتیب دیا اور گمنام ہوتے ہوئے نام کو دوبارہ سے خوش نام کر دیا۔ افسانہ نگار اور مرتبہ کے اوپر ممتاز شاعر پروفیسر شہریار کے ایک مصرعے پر اکتفا کروں گا کہ

مشکل نہیں ہے کچھ بھی اگر ٹھان لیجیے

Dr. Nazar Imam
S/O. Md Khalil Ansari
House No.58, Road No.05
Haroon Nagar Colony, Sector-01
Near, Sudha Dairy Project,
Phulwari Sharif
Patna- 801505(Bihar)
Mob.- 9931448314
imamnazar0@gmailcom

انجم پروین

سرسوتی اسنان کا تجزیاتی مطالعہ

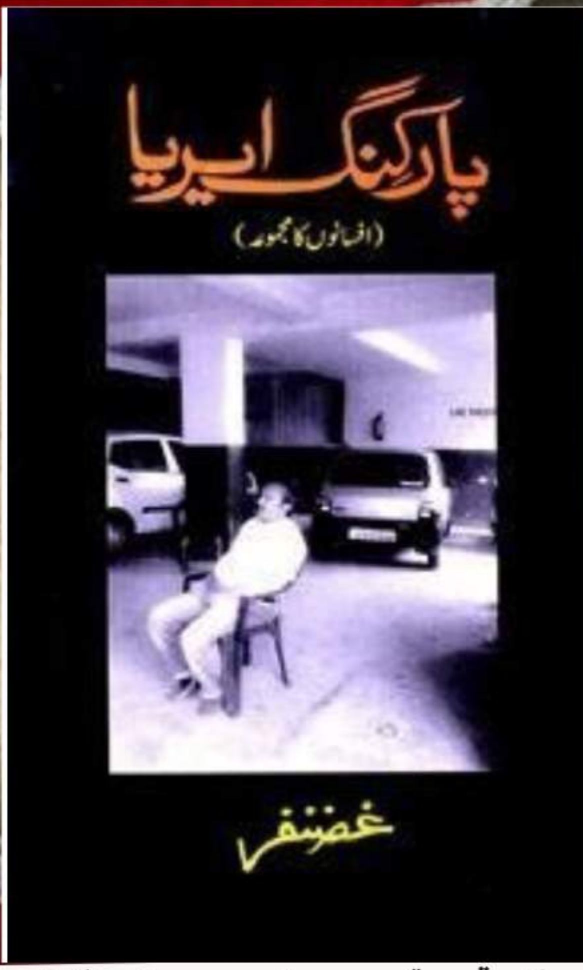

غضنفر اردو ادب کے باوقار ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ کثیر الجہات غضنفر صاحب کا دور مابعد جدیدیت کا ہے غضنفر صاحب نے جہاں شاعری ،ناول ،خاکے لکھ کر اپنی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا ہے وہیں صنف افسانہ میں بھی کچھ کم کمال نہیں دکھائے ۔سرسوتی اسنان غضنفر صاحب کا ایک اہم افسانہ ہے جس میں استعاراتی اور علامتی اسلوب میں بہت سے معاملات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سرسوتی اسنان افسانوی مجموعہ پارکنگ ایریا میں شامل ہے۔ افسانے میں دو کرداروں کے ذریعے بہت سے ایسے نکتے ابھارے گئے ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ افسانے میں سری اجے جسونت رائے سرسوتی اسنان کی تمنا لیے سنگم پر جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات ایک ایسے ملاح سے ہوتی ہے جس کی معلومات غیر معمولی ہے۔سنگم کی سیر کرتے کرتے ملاح اے جے آر کو ایسی ایسی باتیں بتاتا ہے جس میں شدید ذہنی کرب ہے۔ یوں تو بظاہر سرسوتی اور گنگا گھاٹ ایسے مقامات ہیں جہاں ڈبکی لگانے سے سارے پاپ دھل جاتے ہیں اور روح پوتر ہوجاتی ہے لیکن آئے دن سرسوتی اور گنگا میں شامل ہورہی گندگی کی روک تھام کوئی نہیں کرتا۔ افسانے میں سیر کے دوران پرندوں کو دانہ کھلانے کی بھی بات کہی کی گئی ہے یہ وہ رنگین اور دلفریب پرندے ہیں جو دوسرے علاقوں سے دانہ چگنے کے لیے گھاٹ پر آتے ہیں۔ دانہ چگنے کے دوران پرندے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں جس سے وہ زخمی ہوجاتے ہیں اور کئ پرندوں کی موت بھی واقع ہوجاتی ہے۔ اس واقعے سے اے جے آر ان لوگوں کو یاد کرنے لگتے ہیں جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے بیرون ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ وہ لوگ انھیں پرندوں کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے علاقے سے دور صرف دانے کی تلاش میں گھاٹ پر آئے ہیں ذیل کے اقتباس سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

> " توقیر علی! تم واپس کیوں آگئے؛ تمھارے ابا بہت پریشان ہیں. کہہ رہے تھے کہ اتنا سارا خرچ کرکے توقیر کو بھیجا تھا اور وہ کچھ ہی مہینوں میں واپس آگیا۔---------
>
> " بھائی صاحب !ابا کو یہ بات کس طرح سمجھاؤں کہ اپنی زمین تو بعض وجوہات کی بنا پر صرف تنگ ہوئی ہے ہمیں اپنا

دشمن تو نہیں سمجھتی اور ہر وقت بندوق لے کر ہمارے پیچھے تو نہیں پڑی رہتی وہاں تو دشمن سمجھا جاتا تھا اور سوتے، جاگتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ہم پر نظر رکھی جاتی ہے۔"

سرسوتی کا پانی ہرا ہونے کی وجہ ملاح اے جے آر کو بتاتا ہے کہ گنگا کے مقابلے سرسوتی سے لوگوں کی آستھا کم ہے کیونکہ گنگا کو لوگ میا تصور کرتے ہیں اور اسی گنگا کا استحصال کرتے ہیں۔ فیکٹری کی گندگی، سڑی گلی لاش رفع حاجت کے لیے لوگ گنگا کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے گنگا کا پانی میلا ہو گیا ہے۔ یہاں ایک گہرا طنز ہے کہ جس پانی کو عقیدت مندوں کے ذریعہ ماں کی جگہ دی گئی ہے اور اسے اپنے گناہوں سے نجات کا ذریعہ مانا گیا ہے اسی ندی کا استحصال انھیں انسانوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے:

"صاحب جب سارا سنسارا اپنے من اور تن کے ساتھ ساتھ اپنے گھر آنگن اور کل کارخانے کا میل بھی اس میں ڈالے گا تو کیا ہوگا؟۔۔۔ ایک ناؤ کی طرف ملاح نے اشارہ کیا۔۔۔۔۔ ایک ننگ دھڑنگ جسم سے گنگا میں گرنے والے رقیق مادے کو دیکھ کر شرم سے آنکھیں جھک گئیں۔"

سنگم یعنی سرسوتی اور گنگا کے بیان کے بعد ملاح اے جے آر کو ایسا مقام دکھاتا ہے جہاں سرسوتی اور گنگا مل کر بھی ایک دوسرے میں پیوست نہیں ہوتے۔ سنگم کے اس نظارے کی مناسبت سے ملاح بتاتا ہے کہ ایک طرف ہرے رنگ کی سرسوتی جو اپنے پیچھے ایک کہانی رکھتی ہے یعنی کے سرسوتی طوطے کے پر ہے اور اسی وجہ سے ہرے رنگ کی دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف گنگا جو انسانوں کے ذریعہ پھیلائی گئی گندگی سے میلی ہو گئی ہے دونوں کے پیچھے اپنی اپنی وجوہات ہیں لیکن سنگم یعنی ملن کے مقام پر نا سرسوتی گنگا میں ملتی ہے اور نا گنگا سرسوتی میں۔ ٹھیک اسی طرح ہندوؤں کی اپنی روایت، مذہبی عقیدے، لباس ہیں تو وہی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، تہوار، زندگی جینے کے آداب، علیحدہ ہیں لیکن جب یہ دونوں قومیں آپس میں خلوص و محبت سے ملتی ہیں تو گنگا جمنی تہذیب کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ سنگم کے بیان پر اے جے آر کی یادیں ماضی کی طرف مبذول ہو جاتی ہیں جب تنویر چچا عید کے موقع پر اے جے آر کے والد وجے جسونت رائے سے ملنے آتے ہیں افسانہ نگار نے جزئیات میں بڑی مہارت کا ثبوت دے کر ایک سماں باندھ دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"تنویر علی عید کی نماز پڑھ کر عیدگاہ سے گھر لوٹے ہیں۔ ان سے ملنے اے جے آر کے پتا وجے جسونت سنگھ ان کے گھر پہنچے۔ تنویر علی سفید کرتا اور چار کھانے کی لنگی پہنے ہوئے ہیں۔ ان کے سر پر سفید ٹوپی ہے اور وجے جسونت رائے دھوتی کرتے میں ملبوس ہیں ان کا سر خالی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ اس طرح کے دونوں کی باہیں ایک دوسرے کو آغوش میں بھر لیتی ہیں۔ دونوں کی چھاتی ایک دوسرے سے مل جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان ہوا کا گزر بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔"

فنی نقطۂ نظر سے افسانہ خوبیوں کا حامل ہے۔ افسانے میں منظر کشی الہ آباد کے گھاٹ سے لے کر سنگم، سنگم سے لے کر تروینی تک کا منظر بخوبی دکھایا گیا ہے۔ ندیوں کے رنگوں کے بیان سے لے کر مناظر قدرت، پرندوں کا غول، فیکٹریوں کی گندگی، مردہ جسموں کو گھاٹ پر بہانے کا عمل، بڑے احسن طریقے سے بیان کیا گیا ہے جو افسانہ نگار کی باریک بینی کا بین ثبوت ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے جس میں پردیسی پرندوں کی جسمانی خوبصورتی کا ذکر ہوا ہے۔

"یہ کتنے خوبصورت ہیں۔ ان کے کالے اور سفید پر کتنے آکرشک لگ رہے ہیں اور ان کی یہ لمبی چوڑی گلابی چونچ، اس کا تو جواب ہی نہیں! واقعی بہت خوبصورت چونچ ہے ان کی۔"

سرسوتی اسنان کا اسلوب بڑی حد تک متاثر کن ہے۔ غضنفر کی ہندی الفاظ پر مہارت غیر معمولی ہے افسانے کے عنوان سے لے کر افسانے میں استعمال ہونے والے الفاظ ہندی کے ہیں۔ افسانے میں ہندو لوک کتھاؤں کا ذکر کئی جگہ آیا ہے اور جس جزئیات نگاری سے واقعات کا بیان ہوا ہے وہ افسانہ نگار کی غیر معمولی معلومات کی دلیل ہے۔ افسانے میں جہاں گائے کے سینگ پر دنیا کے ٹکے رہنے کی بات کہی گئی ہے تو وہیں جمنا میں ہرا رنگ طوطے کے پروں کی مناسبت سے بیان کیا گیا ہے۔

افسانے میں مرکزی کردار اے جے آر ہیں۔ اے جے آر کے علاوہ اہم کردار میں ملاح ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ ذیلی کرداروں میں اے جے آر کے والد جسونت سنگھ، توقیر علی، تنویر علی، راگھو سنگھ وغیرہ ہیں۔ ملاح کا کردار افسانے میں آغاز سے ہی قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔ سنگم پر جہاں بقیہ ملاح سواری کے پانچ سو چار سو روپے بتاتے ہیں تو وہیں یہ ملاح اپنی سواری سے ہزار روپے وصول کرتا ہے۔ سنگم کے سیر کے دوران وہ اے جے آر کو ایسی ایسی دلچسپ کہانیاں سناتا ہے جس سے اے جے آر اس کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس ملاح کے اندر ایک قناعت ہوتی ہے وہ لالچ سے پرے اپنی سواری کے ساتھ مثبت رویہ

اپنا تا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائے:

"اے جے آر نے اس سنجیدہ اور قدرے معمر شخص کو مخاطب کیا جو ابھی تک خاموش تھا۔ ایک ہزار۔ خاموشی ٹوٹی تو اے جے آر کے کانوں میں گونج پڑی۔

ایک ہزار! اتنا فرق! تمہاری ناؤ کیا سونے کی بنی ہوئی ہے؟ ریٹ کی گونج نے اے جے آر کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی نگاہیں ملاح کی چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"بنی تو ہے لکڑی کی ہی صاحب! اور دوسروں سے الگ بھی نہیں ہے پر میں الگ ہوں۔۔۔۔۔"

مختصر لفظوں میں سرسوتی اسنان غضنفر کا ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں ہندوؤں کی پونیہ استھان ان کی باریک بینی سے منظر کشی کی گئی ہے۔ سرسوتی اور گنگا کے گرد آلود ہونے پر فکر مند ہونے کی ضرورت ہے اور اس کے استحصال کو روکنے کی بھی۔ لوگوں کے ذریعہ قدرتی سرمایہ میں آئے دن گراوٹ ہو رہی ہے انہی میں سے ایک نکتہ غضنفر صاحب نے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ افسانے میں دبے لفظوں میں ملک گیر پیمانے پر ہو رہے ظلم و استبداد کو بھی علامتی و استعاراتی انداز میں بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں کشمیر کی وادیوں میں ہو رہے تشدد سے لے کر بیرون ملک جانے والے نوجوانوں کا درد ہے تو وہیں منافع خور فیکٹری کے مالکان کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو اپنی جیب کو بھرنے کے لیے پرندوں کے لیے ایسے دانے تیار کر رہے ہیں جو پرندوں کی موت کا سبب بن رہی ہے

❒❒❒

Anjum Paween
D/o: Perwaiz Alam
Sher Talab, Railpaar
Vivekanand Nagar
Triple Tower, Near Masjid Rahman
Asansol-713302 (West Bengal)
Mobile 9635671377

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

فرزانہ پروین

جاوید نہال حشمی کی افسانچہ نگاری کا فنی اختصاص

آج کی مصروف ترین زندگی میں ہر شخص شارٹ کٹ کی جانب بھاگتا نظر آ رہا ہے جسے دیکھو مختصر وقت میں اپنے کام کو انجام دینے کی سعی کر رہا ہے ایسے میں جب ہم اردو ادب کی جانب نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ داستان کے زوال کا اہم سبب اس کی طوالت تھی، ناول کا بھی کم و بیش یہی حال ہے افسانے آج بھی لکھے اور شوق سے پڑھے جا رہے ہیں لیکن ان تمام اصناف سے قطع نظر افسانچے کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی اہم وجہ اس کا اختصار ہے۔ جب کوئی طویل فن پارہ ہماری نظروں سے گزرتا ہے تو دلچسپی اور خواہش ہونے کے باوجود ہم اسے بعد میں پڑھنے کا سوچ کر ٹال جاتے ہیں جبکہ افسانچے میں ایسی کشش ہوتی ہے جو قاری کی توجہ فوراً اپنی جانب مبذول کرتی ہے اور قاری اپنا ردعمل بھی فوری طور پر ظاہر کر دیتا ہے۔ افسانچے کی مقبولیت اور اس کی کامیابی فقط اختصار پر منحصر نہیں بلکہ اس میں کہانی پن کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اختصار کے نام پر کچھ بھی لکھ دینا افسانچہ نہیں ہوتا۔ افسانچہ نگاری نہایت مشکل صنف ہے۔ افسانچہ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ جس موضوع کا بھی انتخاب کرے اسے اختصارِ لفظی کے ساتھ اس طرح پیش کرے کہ افسانچہ پڑھنے کے دوران قاری کی دلچسپی برقرار رہے اور اختتام یوں ہو کہ قاری دیر تک سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ مصنف کو ایک ایک لفظ کا استعمال ناپ تول کر نہایت سوچ سمجھ کر کرنا ہوتا ہے۔ بے جا طوالت افسانچے کے تاثر کو زائل کر دیتی ہے۔

معین الدین عثمانی کا خیال ہے کہ:

”کم سے کم لفظوں میں کسی واقعہ کو افسانوی لوازمات کے ساتھ ہنرمندی سے برتنے پر افسانچہ وجود میں آسکتا ہے“

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ رائی کا پہاڑ بنانا آسان ہوتا ہے لیکن سمندر کو کوزے میں سمیٹنا بہت مشکل۔ افسانچہ نگاری سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کا عمل ہے۔ آج ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں سینکڑوں افسانچہ نگار اس عمل میں منہمک نظر آ رہے ہیں اگر میں سرزمین بنگال کی بات کروں تو یہاں کئی ایسے قلمکار ہیں جو صنف افسانچہ نگاری پر طبع آزمائی کر رہے ہیں ان میں سلیم سرفراز، عشرت بیتاب، شگوفہ تمنا، طلعت انجم، جلیل عشرت، محمود یاسین، مقصود دانش، شاہد فروغی، انجم رومان، سید محمد نعمت اللہ، شبیر ذوالمنان، اصغر شمیم، محمد علی صدیقی، شمیم جہانگیری، روشن کمال حشمی، شمشیر علی شعلہ، احمد کمال حشمی، ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا اور جاوید نہال حشمی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جاوید نہال حشمی اور سلیم سرفراز کے افسانچوں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ آسنسول سے تعلق رکھنے والے ادیب سلیم سرفراز کے افسانچوں کا مجموعہ ”وقت خسارے“ سنہ 2021 میں شائع ہوا جبکہ سید

محمد نعمت اللہ، محمد علی صدیقی اور شمشیر علی شعلہ سنجیدگی سے اس فن پر طبع آزمائی کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ان کے مجموعے بھی جلد ہی بنگال کی علمی و ادبی فضا کو معطر کریں گے دیگر افسانچہ نگار وقتاً فوقتاً اس صنف میں طبع آزمائی کر کے اپنی شناخت بنانے میں لگے ہیں۔

جاوید نہال حشمی کا تعلق بنگال کے ایک علمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ ان کے والد حشم الرمضان ایک کہنہ مشق استاد شاعر، ادیب و ناقد تھے جیسے وہ لائق و فائق ویسے ہی ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں، سبھی ماشاءاللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، ایک بیٹی فرحت نشاط حشمی کے علاوہ سبھی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے احمد کمال حشمی بنگال کے نامور شاعر اور ادیب ہیں، ارشد جمال حشمی بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر و نثر نگار ہیں، جاوید نہال حشمی بہترین افسانہ نگار، افسانچہ نگار اور انشائیہ نگار ہیں، خالد اقبال حشمی بھی شاعر ہیں جبکہ شاہد جلال حشمی ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے اپنے علاقے کی فلاح و بہبودی میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنے والد کی یاد میں ایک اسکول بھی قائم کیا ہے جہاں بچوں کو معیاری تعلیم دی جاتی ہے حشم الرمضان کی چھوٹی صاحبزادی عشرت صراط حشمی سرکاری اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں لہٰذا ان کے گھرانے کے لیے فارسی کا یہ مشہور مقولہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است''، مکمل طور پر صادق آتا ہے۔

جاوید نہال حشمی نے علمی و ادبی گھرانے میں پرورش پائی کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا جب یہ چودہ سال کے تھے تو ان کی پہلی کہانی ''سنہرا خواب'' 1981 میں ماہنامہ پیام تعلیم میں شائع ہوئی اس کے بعد لکھنے اور شائع ہونے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور 2016 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''دیوار'' منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے اس کتاب پر انھیں علامہ راشد الخیری ایوارڈ اور بہار اردو اکیڈمی نے اس کتاب پر دس ہزار روپے کے انعام سے سرفراز کیا۔ دیوار کے بعد ان کی دوسری کتاب ''کلائیڈواسکوپ'' جو افسانچوں کا مجموعہ ہے 2019 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انھیں ''پریم چند'' ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے بعد ان کی تیسری کتاب ''کوئی لوٹا دے مرے'' (انشائیوں کا مجموعہ) 2021 میں آئی۔

کلائیڈواسکوپ کو بنگال میں افسانچوں کی پہلی کتاب ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے یہ بیاسی افسانچوں پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جس میں سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔

بقول فیروز عابد:

''جاوید نہال حشمی نوجوان افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے ان کے ہم عصروں سے اس لیے الگ ہیں کہ ان کے اندر سماج اور ماحول دونوں کی وہ ان گنت تصویریں ہیں جو انھیں خون کے آنسو رلاتی ہیں چونکہ وہ ایک اچھے آرٹسٹ بھی ہیں اور قلم کے ساتھ ساتھ برش بھی ان کے اظہار کا وسیلہ ہے تو وہ ذرا الگ ہٹ کر سوچتے ہیں وہ بالکل زمیں سے جڑی ہوئی حقیقتوں کا بیان کرتے ہیں''۔

فیروز عابد صاحب بالکل بجا فرماتے ہیں کہ جاوید نہال حشمی زمین سے جڑی ہوئی حقیقتوں کا بیان کرتے ہیں ان کی کتاب کلائیڈواسکوپ میں بیشتر ایسے افسانچے موجود ہیں جو ہمارے روزمرہ کے حالات و واقعات پر مبنی ہیں لاڈلہ، سلسلہ، فرض کا بوجھ، شک، خدا کی مرضی، لنگی، اورل ٹسٹ، بے جوڑ، نفل روزہ، فورتھ آپشن، نیو جنریشن، انعکاس وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

''نیو جنریشن''، میں آج کی اولاد کی بے راہ روی، شدت پسندی اور ایک والد کی بے بسی کو دکھایا گیا ہے۔ آج کے بچے اب کسی بھی بات یا کام کے لیے والدین یا بزرگوں سے اجازت طلب نہیں کرتے بلکہ انھیں صرف اطلاع دیتے ہیں اور بے بس والدین دل نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی رضا

میں راضی ہو جاتے ہیں کہ انکار کی صورت میں کہیں ان کی اولاد کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔

''لاڈلہ'' ماڈرن سوسائٹی کی ان عورتوں پر براہ راست طنز ہے جن کی اپنی اولادیں تو دایہ کے زیر سایہ پرورش پاتی ہیں اور وہ اپنی ممتا اپنے پالتو کتے پر لٹاتی ہیں۔

''بے جوڑ'' معاشرے کے ان لڑکوں کے لیے ایک سبق ہے جو اچھی، خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کے رشتے بے جوڑ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ لڑکی یا اس کے والدین پر کیا گزرے گی لیکن مزا تب آتا ہے جب ایسے لڑکوں کو کوئی لڑکی اپنے لیے بے جوڑ کہہ کر ٹھکرا دے۔

''مارکیٹ ویلیو'' میں کسی لڑکی کا پرائیوٹ ٹیوشن کے نام پر دیر رات کسی مخصوص علاقے میں جانا اور اس کے پرس سے مخصوص پلز اور وہ چھوٹے سے پیکٹ کا نکلنا کسی اور ہی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔

''دلنگی'' گندی ذہنیت رکھنے والے رحیم صاحب جیسے مسلمانوں کی جانب اشارہ ہے جو فطرہ اور زکوٰۃ کی رقم بھی بادل نخواستہ نکالتے ہیں رحیم صاحب کی ایک قیمتی لنگی جب ان کی بیگم غلطی سے سلیمان چاچا کو دے دیتی ہے تو رحیم صاحب کے تیور بگڑ جاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا کر اپنی بیگم کو کہتے ہیں کہ

''چلو اچھا ہی ہوا کسی غریب کی بروقت مدد ہوگئی''

''انھوں نے حساب لگا لیا تھا۔ وہ دو اور ان کے تین بچے چھیالیس روپے کے حساب سے دوسوتیس روپے ہوتے تھے اور لنگی ڈھائی سو روپے کی تھی''

آج جہیز جیسی لعنت کو ختم کرنے کے لیے جہاں خطبے اور جلسے ہوتے ہیں وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جہیز نہ لینے والوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ''شک'' اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والا خوبرو، سرکاری عہدے پر فائز نوجوان کا قصہ ہے جس کے جہیز نہ لینے پر لڑکی کی ماں شک میں مبتلا ہو کر فکر مندی سے یہ جملہ کہتی ہے کہ

''سنا ہے اس نے کسی بھی قسم کا جہیز لینے سے انکار کر دیا ہے''

ڈاکٹر عظیم راہی صنف افسانچہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ

''افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کر دینے کا نام ہے''

اس سلسلے میں احمد کمال حشمی کہتے ہیں کہ

''افسانچے کو پٹاخے کی طرح ہونا چاہئے جو دیکھنے میں تو چھوٹا ہو مگر اس کی آواز دور تک اور گونج دیر تک سنی جائے''

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاوید نہال حشمی کے افسانچے ان شرائط پر کھرے اترتے ہیں ہم چاہ کر بھی اس کی گونج کو اَن سنی نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کے اثرات کو اپنے ذہن سے جھٹک سکتے ہیں یہ سماج کے جابر حقیقتوں کی منہ بولتی تصویر ہوتے ہیں۔ عکس، چراغ تلے، منی پولیشن، لین دین، سلسلہ، دوزاویوں کا مثلث، فورتھ آپشن، نفل روزہ، درد اور کچلی ہوئی زندگی وغیرہ اس قسم کے افسانچے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان چند ساعت کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور ذہن میں ہوائیاں سی اڑنے لگتی ہیں انسان کچھ پل کے لیے سہی لیکن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''نفل روزہ'' ایک ایسا افسانچہ ہے جس پر پورا افسانہ لکھا جا سکتا ہے عام طور پر مسلمانوں کو اپنے تمام فرائض ماہِ رمضان میں ہی یاد آتے ہیں جب کہ عام دنوں میں ہمارا پڑوسی افلاس، فاقہ کشی سے تنگ آکر جب تک کوئی انتہائی قدم نہ اٹھالے ہمیں اس کی حالت ابتری کا علم ہی نہیں ہوتا ہے لہٰذا ایک اچھا پڑوسی وہی ہوتا ہے جو صرف ماہِ رمضان میں نہیں بلکہ سال بھر اپنے پڑوسی کا خیال رکھے۔

نفل روزہ میں ایک شخص کا مسلکی اختلاف رکھنے والے عابد صاحب سے یہ طنز کرنا کہ پورے رمضان سامنے والی بھکارن کے گھر ہر کوئی افطاری بھیج رہا ہے سوائے آپ کے، تو اس پر عابد صاحب کا یہ جواب ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ

''رمضان کے بجائے میں اس کے نفل روزوں کی افطاری کرواتا ہوں''

''فورتھ آپشن'' سماج کی ہر اس لڑکی کا المیہ ہے جس سے اس کی مرضی کبھی پوچھی نہیں جاتی اس کی زندگی کے سارے فیصلے اس کے والدین لیتے ہیں لڑکی کو کسی بھی معاملے میں بولنے کی اجازت نہیں ہوتی ذہین ہونے کے باوجود نہ اسے آگے پڑھنے دیا جاتا ہے اور نہ ہی انھیں اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ بولنے کی اجازت ہوتی ہے نتیجتاً والدین کی چند شرطوں کی وجہ سے جب لڑکی کی شادی کی عمر نکل جاتی ہے اور اس کے لیے رنڈوے اور طلاق شدہ۔۔۔شادی شدہ مگر بے اولاد۔۔۔پچپن سال کے کنوارے جیسے لوگوں کے رشتے آنے لگتے ہیں تب پہلی بار لڑکی کے والدین اس سے اس کی مرضی پوچھتے ہیں اور تب لڑکی کے پاس فورتھ آپشن کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔

''خدا کی مرضی'' میں معاشرے کی ان عورتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو بچے کی خواہش رکھنے کے باوجود اپنے شوہر کے حکم کے آگے مجبور ہو جاتی ہیں طرہ یہ کہ ابارشن کو مِس کیریج کا نام دے کر پھر اسی شوہر کے ظلم اور

گناہ کی پردہ پوشی بھی کرتی ہیں۔

''منی پولیشن'' شریعت اور قانون کا ناجائز فائدہ اٹھانے والی عورتوں پر گہرا طنز ہے۔

''پسِ پردہ'' نادرہ اور عالیہ جیسی ماڈرن اور بے باک لڑکیوں کی کہانی ہے جو گرمیوں میں اسکین ٹینگ کی پرابلم سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے سر سے پیر تک پردے کا اہتمام کرتی ہیں جسے دیکھ کر لوگوں کو یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ کسی مہذب گھرانے کی پردہ نشیں خاتون ہیں لیکن موسم بدلتے ہیں خود ان کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔ طاہرہ بیگم جو اپنی بیٹیوں سے نادرہ اور عالیہ کی تعریفیں کرتی ہیں دسمبر کے مہینے میں ایک شاپنگ مال میں ان دونوں کو جینز اور ٹاپس میں ملبوس نوجوان لڑکوں کے کندھوں پر ہاتھ مارتے دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہیں اور طاہرہ بیگم جب اس کے حجاب کے متعلق سوال کرتی ہیں تو نادرہ کا یہ جواب حیران کر دیتا ہے کہ

''اوہ کم آن آنٹی۔۔۔۔دسمبر کی دھوپ اتنی تیز نہیں ہوتی کہ اسکین ٹینگ کی پرابلم ہو۔ اور ویسے بھی مال کے اندر کی ہوا پولیوشن فری ہوتی ہے۔۔۔سو۔۔۔ناک اور منہ ڈھکنے کی کوئی لاجک بھی نہیں''

''کلائڈواسکوپ''، میں اسلم صاحب کے کردار کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ میرے منہ پر میری اور تیرے منہ پر تیری والا معاملہ ہے۔ اکرم صاحب جس سے بھی ملتے ہیں اس کی تعریف اور دوسروں کی برائیاں کرتے نظر آتے ہیں اور آج ہمارے اِردگرد ایسے 'خیرخواہ' کی بہتات ہے۔

جاوید نہال حشمی اپنے بعض افسانچوں میں اشارے کنایے سے بھی کام لیتے نظر آتے ہیں آئینے میں قید عکس، زندہ کہانی، سرابوں کے قیدی اور عذاب اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مصنف اپنی بات براہ راست کہنے کے بجائے ایمائیت اور رمزئیت کا سہارا لیتے ہوئے کچھ ذمہ داریاں قارئین پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اپنے طور پر اس کا نتیجہ خود اخذ کر لیں۔

جاوید نہال حشمی ایک اچھے افسانچہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ قابل افسانہ نگار بھی ہیں اور ایک افسانہ نگار جب افسانچہ نگاری کی جانب مائل ہوتا ہے تو ان تمام لوازمات کا خیال رکھتا ہے جو افسانے میں ہوتا ہے اب یہ مصنف پر منحصر ہے کہ وہ کتنی فنکاری سے اسے صفحہء قرطاس پر رقم کرتا ہے اور جب ہم کلائیڈ واسکوپ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جاوید نہال حشمی نے اس فن کے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا ہے میں لفظ مذاق کا استعمال اس لیے کر رہی ہوں کہ آج سوشل میڈیا پر کئی ایسے لوگ ہیں جو افسانچہ نگاری کے نام پر کھیل تماشہ کرتے نظر آرہے ہیں کوئی بے تکا بے ربط سا دو جملہ لکھ کر اسے افسانچہ کا نام دے دیتے ہیں، بعض افسانچہ کے نام پر لطیفہ کہتے ہیں جبکہ افسانچہ ایک سنجیدہ صنف ہے اس میں مزاح و ظرافت کی کوئی جگہ نہیں اس کے لیے طنز و مزاح اور انشائیہ جیسے اصناف موجود ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری رقم طراز ہیں کہ

''افسانچہ کھیل تماشہ نہیں ہے اور نہ ہی لطیفہ بازی بلکہ افسانچہ کا موضوع بھر پور مواد کا تقاضہ کرتا ہے۔ افسانچوں میں اضافی خوبی کے طور پر طنز کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے''

کسی بھی واقعہ کو اس طرح پیش کر دینا جیسے ہم اپنی ڈائری میں رقم کرتے ہیں، افسانچہ نہیں ہوتا بلکہ خوبی تو یہ ہے کہ اسی واقعہ کو فنی مہارت کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس میں افسانچے کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ جاوید نہال حشمی اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی کتاب کلائیڈ واسکوپ کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے افسانچوں کے موضوعات کچھ الگ نہیں ہوتے بلکہ عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات، روزمرہ کی باتیں، معاشرہ اور اس میں ہونے والی برائیاں جنہیں ہم قابل اعتنا نہیں سمجھتے، گھریلو مسائل وغیرہ ہی ہیں لیکن ان موضوعات کو انھوں نے جس کمال فن سے افسانچے کے سانچے میں ڈھالا ہے وہ قابلِ تعریف ہے غیر ضروری طور پر افسانچے کی طوالت میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ کسی پیغام کی ترسیل کے لیے جتنا کہنا ضروری ہوتا ہے اتنا ہی کہتے ہیں۔

لہٰذا ان صفات کی روشنی میں، میں یہ یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ کلائیڈ واسکوپ افسانچے کی چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے اور جاوید نہال حشمی اگر اسی طرح اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ اہل بنگالہ کو ان پر ناز ہوگا۔

□□□

Farzana Parveen
Assistant Teacher
The Quraish Institute
5/1, Kimber Street
Kolkata-700017
Mobile-7003222679
Email-fparveen150@gmail.com

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما

غزلیں

کیوں حسن و جوانی کی پرستار ہے دنیا
اس عیب میں صدیوں سے گرفتار ہے دنیا

ہر لحظہ ہر اک گام دکھاتی ہے نئے رنگ
ہے جیت کبھی اور کبھی ہار ہے دنیا

جن آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں سکھ کا سویرا
ان کے لیے تو صرف شب تار ہے دنیا

تا حد نظر غم کے دہکتے ہوئے صحرا
ایسا لگے آلام کا انبار ہے دنیا

مفلس کے لیے جیسے ہو شمشیر برہنہ
اور صاحب زر کے لیے غم خوار ہے دنیا

یاں جان سے ایمان تلک بکتے ہیں شاما
ہر شخص خریدار ہے بازار ہے دنیا

رونے کی بات کر نہ رلانے کی بات کر
تو ہم نوا ہے گر تو ہنسانے کی بات کر

ترک تعلقات کی ہوتی ہے کچھ وجہ
یوں بے سبب نہ مجھ کو بھلانے کی بات کر

جو زخم بھر چلے ہیں انھیں چھیڑنے سے کیا
دل سے کدورتوں کو مٹانے کی بات کر

شاید تری نجات ہو اس کار خیر سے
بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانے کی بات کر

مایوسیوں کے ذکر سے گھبرا گیا ہے دل
تاریکیوں میں شمع جلانے کی بات کر

تفریق کے ببول سے چھلنی ہوئے بدن
پھر ایکتا کے پھول کھلانے کی بات کر

مدت کے بعد آئے ہیں لمحات قرب کے
شاما نہ آج مجھ سے زمانے کی بات کر

Dr. Joohi Begum
59C/67C, South Malaka
Prayagraj-211003 (U.P)
Mob: 07985982665

بیٹی

ڈاکٹر سمّی اقبال

عزت کیجیے بیٹیوں کی
اپنی ہوں یا غیروں کی
رکھیئے سر پہ ان کو بھی
ہندوں ہوں یا مسلم کی!
بیٹیوں کی ہے ذات جدا
ان کا ہے انداز جدا
مانا کہ کچھ نخرے ہیں
کچھ غمزے، کچھ عشوے ہیں
تھوڑے تھوڑے شکوے ہیں!
شکووں کی اوقات ہے کیا
یہ چھوٹی چھوٹی بات ہے کیا!
جانتی ہیں سارے حق حلال
اسی لیے دیتی ہیں سب کو
ہو کیئر (Who care) میں ڈال
نہ زور کسی کا سہتی ہیں
پوری طاقت سے کہتی ہیں
زندگی یہ ہماری ہے!
اس پر پہلا حق ہے اپنا
اپنے ہر عمل کا
مجھے حساب ہے دینا
پھر زندگی کیوں
کسی کی شرط پر جینا!!
زندگی اپنی، عمل اپنا
عمل کا ہر حساب اپنا
پھر کیوں نہ دیکھوں سپنا!
جو ہے میرا اپنا !!!

Dr.Simmi Iqbal
Assistant Prof. (Urdu)
S.N.Sinha College
Jehanabad-804417 (Bihar)
Mob:8130845047

جل اُٹھے چراغ راہوں میں

خیرالنساء علیم

نکاح کی چھوٹی سی تقریب تھی، تقریباً سارے مہمان جا چکے تھے ...... ہانیہ بھی بیٹھے بیٹھے بہت تھک گئی تھی ...... تب ہی تائی امی نے کہا۔

’’بیٹی ہانیہ! سردی بڑھ رہی ہے، اپنے کمرے میں جاؤ اور آرام کرلو۔‘‘

’’جی تائی امی!‘‘

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی کمرے میں گلاب کی سحر انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ ٹیبل تک آئی اور کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سرخ گلابوں کے ساتھ وِش کارڈ نظر آیا ...... نہ جانے کب زین وہاں رکھ گیا تھا، کارڈ پر لکھا ہوا ایک ایک لفظ اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر رہا تھا ...... وہ محبتوں میں ایسا ہی شدت پسند تھا، شدید تھکاوٹ کے باوجود نیند کہاں؟ اس ستم گر کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی ...... اور آنکھوں میں گویا جگنو اُتر آئے تھے۔

پھر وہ رات اس کی زندگی کی سب سے حسین و یادگار رات بن گئی ...... اگلی صبح زین واپس چلا گیا ......

ریاض احمد نے اپنے آفس کی ایک برانچ بنگلور میں کھولی تھی ...... جس کو زین ہی سنبھالتا تھا، جیسے ہی وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا ...... چند ہی مہینوں میں شوکت بیگم کو رخصتی کروانے کا خیال ستانے لگا۔

’’تایا ابو! پلیز ...... آپ تائی امی کو سمجھائیں نا ...... رخصتی بعد میں بھی ہو سکتی ہے، میں اس کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہوں۔‘‘

’’ہانیہ بٹیا! آپ کیوں تیار نہیں ہو ...... آپ کو کرنا ہی کیا ہے ...... سب کچھ شوکت بیگم کریں گی ...... تمھیں تو اپنے کپڑوں کی شاپنگ کرنی ہے اور بس۔‘‘ انھوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

’’تایا ابو! میں اپنے اگزام کی تیاری کیسے کروں گی؟ ......‘‘

’’یہ تو کوئی خاص وجہ نہیں ہانیہ! تم تو ایک ہفتے میں بھی امتحان کی تیاری کر سکتی ہو، اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہے تو بتاؤ ......‘‘ انھوں نے نرمی سے کہا۔

’’نہیں! اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔‘‘ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

’’بس تو پھر بیٹا جانی! خوش خوش اپنی امی کے ساتھ تیاری میں ہاتھ بٹائیں اور ہنستی مسکراتی میرے بیٹے کی زندگی میں داخل ہو جائیں۔‘‘ انھوں نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

ہانیہ کی رضامندی پاتے ہی ریاض احمد اور شوکت بیگم کی خوشی دیدنی تھی ...... تاریخ طے ہوتے ہی مایوں اور ڈھولکی کا پروگرام رکھ لیا گیا ...... کل زین بھی پہنچنے والا تھا ...... وہ اس کو فون کرنے کے لیے آگے بڑھی ہی تھی کہ گھنٹی بج اٹھی ...... اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

’’ہیلو! اوہو آپ ......‘‘

’’ہانیہ! ہاں یہ میں ہی ہوں زین! کیسی ہو ...... ایک گھنٹے بعد نکلنے والا ہوں، سوچا تم سے بات کرلوں ...... تمھیں کچھ چاہیے تو نہیں، دو دن سے ٹرائی کر رہا تھا، لیکن تم سے بات ہی نہ ہو سکی۔‘‘

’’اتنی رات کو سفر نہ کریں، کل آ جائیے گا۔‘‘

’’نہیں ہانیہ! اب اور نہیں رک سکتا ...... اگر بزنس پرابلم نہ ہوتا تو آج ہی پہنچ جاتا، دعا کرنا کہ سفر خیریت سے گذرے۔ اللہ حافظ۔‘‘

اس نے کارڈلیس ٹیبل پر رکھ دیا، اور وہاں رکھی امی پاپا کی تصویر کو دیکھنے لگی۔

’’آپ بقید حیات ہوتے تو دیکھتے کتنی محبتیں میرے گرد حصار کیے ہوئے ہیں، بہت جلدی کی آپ دونوں نے جانے میں ...... میرے پاس تو آپ کی واضح یاد بھی نہیں ہے۔‘‘ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر نکل آئے۔

ہانیہ صرف دو سال کی تھی جب فیاض احمد اور زرینہ بیگم اپنے ایک دوست کی شادی میں شرکت کر کے واپس ہو رہے تھے کہ ان کی کار ایک درخت سے ٹکرا گئی، حادثہ اتنا شدید تھا کہ دونوں ہی جاں بحق ہو گئے ......

جب ان دونوں کی خون میں نہائی لاشیں لائی گئیں تو ننھی سی ہانیہ ہمیشہ کے لیے تائی کی گود میں آ گئی۔

ٹرن ......ٹرن...... وہ ماضی کے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی ...... فون کی گھنٹی اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی ...... گھڑی پر نظر پڑی ...... رات کا ایک بج رہا تھا۔

''زین تو چار بجے تک پہنچیں گے۔'' اس کی سوچ کا دھارا ماضی سے حال میں آ گیا، دوسری بل پر ہاتھ بڑھا کر کارڈلیس اٹھالیا۔

''ہیلو!'' اس نے تایا ابو کی آواز سنی، فون رکھنا ہی چاہ رہی تھی کہ غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سننے لگی۔

''یہ زین احمد صاحب کا گھر ہے۔'' اجنبی آواز ابھری۔

''جی! لیکن آپ کون؟''

''جی! میں شاہد بنگلور ہاسپٹل سے بول رہا ہوں، زین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ یہیں ایڈمیٹ ہیں، آپ لوگ جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کریں۔''

''ڈاکٹر! کوئی خطرے والی بات تو نہیں نا؟'' ریاض صاحب نے تڑپ کر پوچھا۔

''نہیں! انشاءاللہ، اللہ رحم کرے گا...... آپ بس فوراً پہنچیں۔''

''تایا ابو!'' اس نے روتے ہوئے انہیں پکارا۔

''فکر نہ کرو بیٹا! اللہ پر بھروسہ رکھو، انشاءاللہ زین کو کچھ نہیں ہوگا۔'' انھوں نے ہانیہ کو گلے لگا کر تسلی دی۔

''میں تائی امی کو اٹھاتی ہوں۔'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے آگے بڑھ گئی۔

ریاض صاحب اپنے ڈرائیور غفور کو اٹھانے اس کے کوارٹر پہنچے۔

''غفور! جلدی اٹھو...... زین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا...... تم فوراً گاڑی نکالو۔''

ایکسیڈنٹ بہت شدید تھا...... دائیں ٹانگ بری طرح سے متاثر ہوئی تھی، لیکن فی الحال اس کی زندگی بچانے کے لیے ڈاکٹر ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

شادی کا دن آیا اور گذر گیا...... لیکن اس کی بے ہوشی نہیں ٹوٹی، اس کی دائیں ٹانگ کاٹ دی گئی...... ڈاکٹر فکرمند تھے کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اگر اسے ہوش نہ آیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ہانیہ، شوکت بیگم کے پاس بیٹھی تھی، اُن دونوں کے ہی آنسو رک نہیں رہے تھے...... ڈاکٹر شاہد کمرے میں آتے ہی سب کو خوشی کی نوید سنائی کہ ''زین کو ہوش آ گیا ہے...... اللہ کا شکر ہے خطرہ ٹل گیا ہے...... زین کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔'' شوکت بیگم فوراً سجدۂ شکر بجالائیں۔

دو ماہ بعد اسے دواخانے سے ڈسچارج کر دیا گیا...... گھر آنے پر وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ ہانیہ کے سلسلے میں کیا فیصلہ کیا جائے......؟ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ہانیہ کے رویّے میں کوئی فرق نہ تھا...... وہ ہمیشہ سے زیادہ اس کا خیال رکھ رہی تھی، اپنے پیپرز کے دوران بھی وہ اس سے غافل نہیں رہی تھی۔

''امی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' زین نے سوپ پینے کے بعد خالی پیالہ شوکت بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔

''کہو بیٹا! کیا بات ہے؟'' شوکت بیگم نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی! آپ نے ہانیہ کے بارے میں کیا سوچا ہے، اب مجھ جیسے معذور شخص کے ساتھ وہ ساری زندگی نہیں گذار سکتی نا۔'' اس نے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''زین! سنبھالو اپنے آپ کو...... کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا۔'' شوکت بیگم تڑپ گئیں، اور کمرے میں آتی ہانیہ، زین کی باتیں سن کر پتھر کی مورت کی مانند کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''اب تو تم زین! مصنوعی ٹانگ کے ساتھ آرام سے چل پھر سکتے ہو، پھر معذوری کیسی...... بیکار قسم کی سوچوں میں اپنے آپ کو مت تھکاؤ ...... ہانیہ کی طرف سے مطمئن رہو بیٹا...... وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی، میری تربیت پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔'' شوکت بیگم نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''لیکن امی! کب تک...... ایک نہ ایک دن تو اسے اپنے فیصلے پر پچھتاوا ضرور ہوگا، میں نہیں چاہتا کہ ایسا کوئی لمحہ میری زندگی میں آئے۔'' زین نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

کچھ دیر بعد ہلکی سی دستک دیتے ہوئے ہانیہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو زین؟''

''اچھا ہوا ہانیہ...... تم آ گئیں...... مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' زین نے ہانیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ کیا باتیں کرنی ہیں، دن بھر میں آپ کے ساتھ ہی تو ہوتی ہوں، کہیے، کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے زین کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہم زیادہ دن تک اس رشتے کو نہیں نبھا سکیں گے...... رخصتی ہونے سے پہلے تم ہر قسم کے فیصلے میں آزاد ہو...... ہر حال میں، میں تمہارے فیصلے کا احترام کروں گا۔'' دل کی آواز دبا کر وہ بولتا

چلا گیا۔
''زین!......منکوحہ ہوں میں آپ کی ......آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟'' وہ بے چین ہوگئی۔
''صرف نکاح ہی ہوا ہے نا......رخصتی نہیں ہوئی۔'' اس کے بے تاثر لہجے نے ہانیہ کو خون کے آنسو رلا دیا۔
''اور اگر رخصتی کے بعد یہ حادثہ ہوتا تو کیا آپ مجھے یوں ہی چھوڑ دیتے؟'' وہ آخری سانس تک اس کا ساتھ نبھانا چاہ رہی تھی۔
''اس وقت کی بات کچھ اور تھی ...... ہانیہ! تم ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش تو کرو، آج تمھیں مجھ سے ہمدردی ہو رہی ہے، مگر چند سال بعد اکتا جاؤ گی......ایک معذور انسان کے ساتھ زندگی گذارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔''
''آپ نہیں جانتے زین ...... ہمارے معاشرے میں طلاق یافتہ لڑکی کا کیا مقام ہے، مجھے بھی اس صف میں شامل کر رہے ہو۔'' اس نے جذباتی طریقے سے اسے منانا چاہا۔
''میں خود تمہاری شادی کرواؤں گا۔'' اس نے رخ موڑتے ہوئے کرب سے کہا۔
''بہت خوب! ایک شوہر اپنی بیوی کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ جوڑے گا کہ میری بیوی سے شادی کر لو۔''
''یہ تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔''
''یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے......اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے......آپ یقین کریں یا نہ کریں......اگر نکاح نہ بھی ہوتا اور آپ معذور ہو جاتے ...... تب بھی میں صرف آپ ہی کی ہم سفر بنتی۔'' اس نے بڑے ہی مان ورسان سے کہا۔
''میں نہیں چاہتا کہ میں تمہارے سامنے رہوں، جس سے تمھیں فیصلہ کرنے میں مشکل ہو......میری غیر موجودگی میں تم آسانی سے فیصلہ کر سکتی ہو۔'' بنگلور جانے سے پہلے وہ ہانیہ کے سامنے کھڑا تھا۔
زین کے بنگلور جانے کے بعد گھر میں سب کے لیے مایوسی و بے بسی کا احساس ہر لمحہ کچوکے لگاتا رہتا......تائی امی نے بالکل چپ سادھ لی تھی......تایا ابو گھنٹوں خلاؤں میں گھورتے رہتے۔
اب ریاض احمد مزید خاموش رہنا نہیں چاہتے تھے، اسی لیے انھوں نے ہانیہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔
''ہانیہ! تم اپنے دل کی بات مجھ سے کرنے میں کوئی تکلف نہ کرو بیٹی......زین اگر میرا بیٹا ہے تو تم بھی میرے لیے بیٹی سے بڑھ کر ہو...... اگر تمھیں اس کا ساتھ منظور نہیں ہے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے...... دونوں کے ہیں میری نظر میں، اگر تم!!'' انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''تایا ابو! آپ بھی مجھے سمجھ نہ سکے ......'' دکھ سے اس کی آواز کانپ گئی۔
''میں جانتا ہوں ہانیہ ......مگر تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں، کہیں یہ خلش میرے دل میں نہ رہ جائے کہ ...... ہمارے خلوص و پیار و محبت نے تمھیں زبردستی اس رشتے سے باندھ رکھا ہو۔''
''تایا ابو! ساری منفی باتیں آپ اپنے دل سے نکال دیجیے ...... میں نے ہمیشہ آپ کو اور تائی امی کو اپنے ماں باپ ہی سمجھا ہے......آپ کا فیصلہ مجھے دل و جان سے قبول ہے، میں زین سے بہت محبت کرتی ہوں ......اور اس وقت سے جب میں محبت کے معنی بھی نہیں جانتی تھی۔'' کہتے ہوئے وہ رکی نہیں، کمرے سے باہر چلی گئی......اور ریاض احمد نے اطمینان کا سانس لیا۔
''زین! بیٹے جان! اب بتائیں کیسا رہا آپ کا ٹور......ایرپورٹ پر گلے لگتے ہوئے ریاض احمد نے پوچھا۔
''ہمیشہ کی طرح بہت زبردست۔'' وہ بزنس ٹور پر دس دن کے لیے جرمنی گیا ہوا تھا، گیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔
''اتنی سجاوٹ......خیریت!'' اس نے رحمت چاچا سے پوچھا۔
''یہ آپ کے آنے کی خوشی میں ہے چھوٹے بابا!'' انہوں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔
امی اس کے گلے لگ کر آب دیدہ ہوگئیں......ریاض احمد ضروری میٹنگ کا کہہ کر آفس چلے گئے تھے۔
''میں نے تمہارا کمرہ کھلوا دیا ہے......آرام کرو......تھوڑی دیر بعد تمہارے بابا بھی آجائیں گے۔'' انھوں نے شفقت سے بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔
بستر پر لیٹا ہانیہ کے متعلق سوچ رہا تھا، باوجود تھکن کے نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، کمرے میں چھائی خاموشی سے تنگ آ کر وہ باہر نکل آیا۔
''امی! بابا ...... آگئے ہیں؟'' اس نے ان کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''السلام علیکم!'' ریاض احمد کی آواز نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
''کیا خیال ہے بیگم! لے چلیں صاحبزادے کو شاپنگ کے

لیے......"

"شاپنگ؟ میرے ساتھ؟ نہیں امی ...... مجھے کچھ بھی نہیں خریدنا ہے۔" اس کے چہرے سے بیزاری ظاہر ہو رہی تھی۔

"کیا مطلب زین؟ اپنی دلہن کو منہ دکھائی میں کچھ نہیں دو گے؟" بابا نے کھلکھلاتے لہجے میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسی دُلہن؟ امی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"آپ نے زین کو کچھ نہیں بتایا؟" انہوں نے ریاض احمد سے سوال کیا۔

"اب بتا دیتے ہیں شوکت بیگم، برخوردار کل آپ کی شادی ہے ......آج ۸۔۹ بجے تک مہمان آنا شروع ہو جائیں گے......مہندی کی رسم کے لیے......"

"کیا؟" وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"زین! پلیز ...... ہماری خوشی سے تو تمہیں کوئی غرض نہیں ...... لیکن عزت کا ہی پاس رکھ لو۔" انہوں نے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

اب زین کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مہندی اور بارات کی تقاریب میں اس نے خاموشی اختیار کر لی ...... بابا نے ہانیہ کی مرضی کے بغیر ہی رخصتی طے کر دی......سارا ارینجمنٹ ہوٹل میں ہوا تھا، زین کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے امی نے رخصتی جلدی کر دی۔

"زین! میری بیٹی کو لے جا رہے ہو، دھیان رکھنا، اپنی محبت میں کبھی کمی نہ کرنا، اسے کوئی تکلیف نہ دینا، میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔" ریاض احمد نے ہانیہ کا ہاتھ زین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے محبت و رقت سے کہا......وہ جھکا سر اُٹھا نہ سکا۔

گھر آ کر امیٔ ہانیہ کو زین کے کمرے میں چھوڑ آئیں، تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر لے اور وہ باہر لان میں بیٹھا دوستوں کی گپ شپ سن رہا تھا۔

خوبصورت کمرے میں قدم رکھتے ہی گلاب اور موتیا کی دلفریب مہک نے اسے اپنے حصار میں لے لیا، اس سے قدم اٹھائے نہ جا رہے تھے، امی اسے کمرے تک چھوڑنے خود نہ آتیں اور بابا باہر خبریں نہ سن رہے ہوتے تو شاید کمرے میں بھی نہ آتا......خودساختہ ایک سوچ اس کے ذہن میں کنڈلی مار کر بیٹھ گئی کہ ہانیہ اپنی خوشی سے اس کی زندگی میں نہیں آئی؛ بلکہ بابا نے زبردستی شادی کروائی ہے۔

حجلۂ عروسی میں اس کی منتظر ہانیہ پر ایک نظر ڈالنا بھی اس نے گوارا نہ کیا...... بیزارگی سے اس کا گفٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے واش روم میں گھس گیا، وہ خاموشی سے پہلے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتی ہوئی اُٹھ بیٹھی، اپنے پورے زیور اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کے ڈرا میں رکھے ...... جب وہ کپڑے تبدیل کر کے آئی تو زین آئینے کے سامنے کھڑا برش سے اپنے بال سنوار رہا تھا۔

اور نیند تو اس رات دونوں ہی سے روٹھ گئی تھی ......عجیب بات یہ کہ دونوں کو ایک ہی دکھ تھا کہ "اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔"

وہ بہ مشکل چند دن وہاں رُکا تھا، جیسے ہی بنگلور جانے کی بات کی تو بابا نے ہانیہ کو بھی سامان پیک کرنے کو کہا...... یوں بابا کے ڈر سے وہ دونوں ہی کچھ نہ کہہ سکے۔

بنگلور پہنچنے پر بھی زین کا غصہ یوں ہی برقرار رہا، ہانیہ کے لیے وہ یہاں بھی ایک سزا ہی تیار کر رکھا تھا۔

"ملازم گھر میں موجود ہیں، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات ہو جو بابا کو شکایت کا موقع فراہم کرے، اس لیے تم اپنا سامان اسی کمرے میں سیٹ کر لو، جب تک کہ تم کوئی فیصلہ نہیں کر لیتیں۔" تلخ لہجے میں کہتا وہ باہر نکل گیا۔

اس کے آفس جانے کے کچھ دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجی......تب ہانیہ نے فون ریسیو کیا......تائی امی بات کر رہی تھیں۔

"کیسی ہو ہانیہ؟" "تم نے تو فون کرنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے......سمجھ سکتی ہوں، کچھ دن گو گھر سیٹ کرنے میں مصروف رہی ہو گی......لیکن اب فون کے ذریعے ہی اپنی خیریت کی اطلاع دیتی رہو...... میں کچھ دن تم لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی......مگر تمہارے تایا ابو کو اکیلے چھوڑ کر نہیں آ سکتی...... کیا ہوا بیٹی! کچھ تو بات کرو۔" شوکت بیگم نے بڑے ہی مان و محبت سے کہا۔

"کیا کہوں تائی امی! کہنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں، اچھی ہوں اور خوش بھی۔" اس کی آواز کی مایوسی سے شوکت بیگم پریشان ہو گئیں۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" رات کو زین کی سائڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے ہانیہ نے کہا تو اس نے ایک نگاہِ غلط اس پر ڈالی۔

"کہو!" سرسری لہجے میں کہا گیا۔

"آج تائی امی کا فون آیا تھا......ان کے بات کرنے کے انداز سے محسوس ہوا کہ انہیں شک ہو گیا ہے......کہ ہم لوگ خوش نہیں ہیں۔" آخر اس نے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''تو کہہ دینا تھا امی سے کہ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔''

''جھوٹ کیوں کہتی......؟ میں تو آپ کے ساتھ خوش ہوں۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں...... ایک معذور شوہر کے ساتھ کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے۔'' اس نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''بس کریں زین! پتا نہیں آپ اس خود ساختہ بے چارگی سے کب باہر آئیں گے؟ محبتوں میں تو بہت وسعت ہوتی ہے زین! جو کچھ ہوا اس میں کسی کا بھی قصور نہیں، یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔'' ہانیہ آہستہ آہستہ اس کے دل میں محبت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، چند سالوں میں ہی تم اپنے فیصلے پر بہت پچھتاؤ گی، اب بھی موقع ہے ہانیہ......تم اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔''

''اپنی سوچ کو بدلیں زین...... اس خود ساختہ محرومی سے باہر آجائیں...... بہت سی خوشیاں اور گل رنگ لمحے ہماری تلاش میں ہیں، بس انھیں دل کے آنگن میں بسانے کی دیر ہے...... وہ محبت و چاہت جو تمھیں اس مضبوط رشتے میں باندھے ہوئے ہے، اسے یوں بے حقیقت مت جانیں......قدرت کے فیصلوں کی قدر کریں......ورنہ سوائے پچھتانے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' گالوں پر آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھی اور اس کے لیے سوچ کا ایک اور دَر وَا کر گئی۔

''اس کی عطا ہے کہ ہم دیکھ، سن، بول اور سمجھ سکتے ہیں، وہی ہے جس نے ہمیں ہاتھ پاؤں کی طاقت دی، تاکہ ہم چل پھر سکیں، لیکن یہ ہمارا ناشکرا پن ہی ہے کہ ہم تندرستی اور اچھی صحت کے لیے شکر ادا نہیں کرتے، لیکن کسی ایک محرومی سے ہم تڑپ اٹھتے ہیں، پھر ہم اس محرومی پر ساری دنیا سے روٹھ جاتے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم اس قادرِ مطلق کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس سے ہر لمحہ گلہ کریں جس سے اللہ تعالیٰ کے گنہگار کہلائیں اور دوسری طرف خود کو اذیت میں مبتلا کریں...... ہمیں اس کے فیصلوں پر راضی بہ رضا رہنا ہوگا، ورنہ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ کس طرح اللہ رب العزت نے اپنے نافرمان بندوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا ہے۔''

نماز جمعہ سے پہلے مولانا صاحب کے پُر اثر خطبے نے ہانیہ کی کہی ہوئی باتوں کو مزید وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

کافی سوچنے، غور و فکر کے بعد وہ اپنے فیصلے کو بدل چکا تھا...... اسے لگا تھا جیسے اس کی سانس رکنے لگی ہے...... ایک ایک کر کے اسے اپنی کوتاہیاں یاد آ رہی تھیں۔

وہ بہت دیر سے ہانیہ کو دیکھے جا رہا تھا...... اور گزرا ہوا ہر پل اس کے سامنے آ رہا تھا، وہ ہانیہ کا ہی نہیں، خود اپنا بھی مجرم تھا...... جو اپنی خوشیوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں نقب لگا رہا تھا۔

زین کو اپنا محاسبہ کرنے پر محسوس ہوا کہ جیسے خوشگوار ہوا کے جھونکے اس کے اندر کی تپش اور گھٹن کو ختم کر رہے ہیں، ابھی توبہ کا در بند نہیں ہوا تھا......اور اس کی توبہ قبول ہو گئی تھی۔

اس نے بہت محبت سے ہانیہ کے ہاتھوں کو تھام لیا...... اور بہت دھیرے دھیرے سرگوشی کی صورت اس کی زبان پر ''الحمدللہ'' کا ذکر جاری ہو گیا۔

''آخر وہ کون سے نفل تھے جو تم رات کے اس پہر پڑھ رہی تھیں۔'' زین، ہانیہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''وہ اصل میں مجھے شکرانے کے نفل پڑھنے تھے، اللہ تعالیٰ کا بھی تو شکر ادا کرنا چاہیے نا، ورنہ دیر ہو جاتی۔'' ہانیہ کے بتانے پر وہ ہنس پڑا۔

''کیا ہوا'' ہانیہ نے استفسار کیا۔

''کچھ نہیں! میں نے بھی اسی لیے صبح فجر سے پہلے نفل ادا کیے تھے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے...... اور اللہ تعالیٰ کی محبتیں کہیں ہماری آزمائش نہ بن جائیں...... یہ میرے مالک کا احسان ہی تو ہے جو اس نے ہمیں ایک دوسرے سے محبت کی اَن دیکھی زنجیر میں باندھ دیا ہے...... سو اس کا شکر تو لازم ہے نا۔''

اس نے ہانیہ سے بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھ محبت سے تھام لیے...... ہانیہ اس کی محبت کو پا کر بے حد خوش تھی...... اس کے دل سے ساری کدورتیں دُھل گئی تھیں۔

اب وہ دونوں ہی جان گئے تھے کہ دنیاوی کاموں میں چاہے دیر ہو جائے......لیکن اس ذات باری تعالیٰ کی محبتوں کا اس سے بہتر جواب اور کوئی نہیں تھا...... اور وہ اس کے روبرو ہو کر بہت محبت کے ساتھ سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اب کی بار اس نے حقیقتاً دیر نہیں کی تھی۔

یوں محبتوں میں روٹھے ہوئے دو مسافر ایک ہی سمت میں قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔

□□□

Khairunnisa Aleem
H.No: 16-2-141/B
Flat No: 301,
Near Officers Mess
Malakpet
Hyderabad-500036 (T.S.)

افسانہ

چھٹیاں

ڈاکٹر عنبر عابد

ہم غمِ روزگار کے قیدی
چھٹّی پیرول سی لگے ہم کو

موبائل کی رِنگ ٹون کے ساتھ ہی خنسا پہلے سے زیادہ تیزی سے کام نپٹانے لگی۔ اگلے پانچ منٹ میں اُس کی اسکول بس اسٹاپ پر آجائے گی۔ اُلٹا سیدھا، بے ترتیب جوڑا اور جلدی میں باندھی گئی ساڑی کو کمر سے لپیٹ کر اس نے موبائل پرس میں ڈالا اور تقریباً دوڑتی ہوئی مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اسٹاپ گھر سے زیادہ دور نہیں تھا اور بس کنڈکٹر بھلا آدمی تھا اس لیے پچھلے اسٹاپ سے وہ ایک مس کال خنسا کو دے دیا کرتا تھا۔ ہانپتی کانپتی وہ اسٹاپ پر پہنچی اور بس آگئی۔ وہ اس میں سوار ہوگئی۔ اپنی طے شدہ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور ایک طائرانہ نگاہ بس میں بیٹھے بچوں پر ڈالی۔ بس تقریباً آدھی بھر چکی تھی۔ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے بچّے اس سرد سی صبح میں کچھ سوئے کچھ جاگے یا اونگھ رہے تھے۔

خنسا نے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی اور تھوڑا پانی حلق میں الٹ لیا۔ اس سرد موسم میں بھی صبح کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

''اُف آج پھر لنچ باکس میز پر ہی بھول آئی۔''

جلد بازی میں وہ آج پھر لنچ باکس گھر بھول آئی تھی۔ بس تیز رفتاری سے اسکول کی جانب دوڑ رہی تھی۔ بس کی رفتار کو خنسا کے دماغ میں چکراتے خیالات و سوالات مات دے رہے تھے۔

اس معاشرے میں ہر شخص کی اپنی ایک شناخت ایک دائرۂ عمل اور اپنی زندگی ہوتی ہے۔ ہر چھت کے نیچے زندگی کا ایک الگ رنگ ایک الگ تصویر ہوتی ہے۔ اپنے اپنے دائروں میں بٹی یہ زندگی کہیں ایک شوخ و چنچل لاابالی حسینہ کی طرح ہے تو کہیں عیش و عشرت کے مخملی کمخاب میں لپٹا کوئی بیش قیمتی زیور ہے اور کہیں یہ ذمہ داریوں، مسائل اور پریشانیوں کے بوجھ تلے اس طرح دبی ہوئی ہے کہ سانس لینا بھی محال ہے۔ غرض یہ کہ زندگی مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے، کسی کی کیسی، کسی کی کیسی!

اس طرح کے خیالوں کی تتلیاں اکثر خنسا کے ذہن میں اُڑا کرتیں اور وہ خود کو سمجھاتی .... ذمہ داریاں بوجھ نہیں بلکہ جینے کی وجہ اور حوصلہ ہوا کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ حالات بدلتے ہیں سو یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ بچے بڑے ہو کر خود کفیل ہوں گے تو یہ بھاگ دوڑ بھی کم ہو جائے گی۔ بڑا بیٹا دسویں، منجھلا آٹھویں اور چھوٹی بیٹی چھٹی جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ شوہر کا اپنا بزنس تھا۔ امور خانہ داری کے کاموں میں اور اپنی جاب کی

ذمہ داریوں کے بیچ اکثر خنسا توازن برقرار نہ رکھ پاتی اور اس کے حوصلے پست ہونے لگتے تو وہ اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھتی تو اللہ کا شکر بجالاتی اور یہ شکر یہ اسے جینے کا ایک نیا حوصلہ عطا کر دیتا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس کی زندگی کا یہی معمول تھا، اور زندگی آگے بڑھتی رہی۔

اپنی نوکری کے سلسلے میں بڑے بیٹے نے دوسرے شہر کا رُخ کیا۔ منجھلا بیٹا تلاشِ روزگار میں بیرون ملک جابسا۔ بیٹی نے بھی رخصت ہوکر دوسرے شہر کو آباد کیا۔ بچوں کی شادیاں ہوئیں، ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئی تو دیکھا کہ آئینہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ اس کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار صاف نظر آرہے ہیں۔ چہرے کی صاف شفّاف کتاب پر عمر کی کئی لکیریں درج ہوچکی ہیں۔ اس کی تیز رفتار چال اب دھیمی اور سست ہوگئی ہے۔ صحت بھی اب دغا دے رہی ہے۔ یہ پندرہ سال اپنے ساتھ کیا کیا لے گئے ہیں اور پیچھے چھوڑ گئے ہیں گھر میں چیختی تنہائی، گونجتے سنّاٹے اور گہرا خالی پن، جو خنسا کے اندر باہر ہر طرف پھیل چکا ہے۔ نوکری کے ابھی دس برس باقی ہیں۔ اسکول بس کی رفتار وہی اور خنسا کی بھاگ دوڑ بدستور جاری ہے۔

اپنی نوکری کے سلسلے میں بڑے بیٹے نے دوسرے شہر کا رُخ کیا۔ منجھلا بیٹا تلاشِ روزگار میں بیرون ملک جابسا۔ بیٹی نے بھی رخصت ہوکر دوسرے شہر کو آباد کیا۔ بچوں کی شادیاں ہوئیں، ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئی تو دیکھا کہ آئینہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ اس کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار صاف نظر آرہے ہیں۔ چہرے کی صاف شفّاف کتاب پر عمر کی کئی لکیریں درج ہوچکی ہیں۔ اس کی تیز رفتار چال اب دھیمی اور سست ہوگئی ہے۔ صحت بھی اب دغا دے رہی ہے۔ یہ پندرہ سال اپنے ساتھ کیا کیا لے گئے ہیں اور پیچھے چھوڑ گئے ہیں گھر میں چیختی تنہائی، گونجتے سنّاٹے اور گہرا خالی پن، جو خنسا کے اندر باہر ہر طرف پھیل چکا ہے۔ نوکری کے ابھی دس برس باقی ہیں۔ اسکول بس کی رفتار وہی اور خنسا کی بھاگ دوڑ بدستور جاری ہے۔

اب خنسا کی سوچیں مختلف ہیں۔ کاش ان بیحد تھکان والے دنوں کے بعد کوئی لمبی چھٹی میسر ہوتو وہ دن چڑھے تک سوتی رہے۔ گرما گرم چائے کے پیالے کے ساتھ صبح کا اخبار پڑھے..........سردی کی کنکنی دھوپ کا لطف لے۔ کچھ دن تو کم سے کم اسے آرام کے میسر ہوں تو وہ گھڑی کی سوئیوں پر سے اتر کر کسی پُرفضا مقام پر کچھ فرصت کے لمحات گزار سکے۔ اپنے جسم و جاں کی تھکن اتار سکے، چند سکون کی سانسیں لے سکے...... جی سکے......!

لیکن اب چھٹیاں اپنے ساتھ بہت سے کام اور ڈھیروں مصروفیات لے کر وارد ہوتی ہیں۔ تینوں بچے اپنے اپنے کنبے کے ساتھ گھر کا رخ کرتے ہیں۔ گھر ہنسی مذاق اور قہقہوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ بہت سے دلچسپ پرانے قصّے دہرائے جاتے ہیں۔ گھر گھر لگنے لگتا ہے۔ گھر کا ہر فرد اپنی چھٹی کو پوری طرح انجوائے کرنا چاہتا ہے۔

خنسا کوشش کرتی بیٹی کی تھکان اُتر جائے...... کچھ میکے کا آرام اُسے حاصل ہو۔ وہ بچوں کے پسندیدہ کھانوں کو تیار کرنے میں گھنٹوں کچن کے پلیٹ فارم پر کھڑی رہتی۔ اس کا کمرہ، بستر، تکیہ، کمبل سب بٹ جاتا۔ جس کو جس کسی چیز کی ضرورت ہوتی اس کے کمرے سے اٹھالی جاتی اور اس کے ساتھ میلے کپڑوں اور جھوٹے برتنوں کا انبار، کتابیں، کھلونے اور بکھری دیگر اشیا جنھیں سمیٹتے سمیٹتے وہ خود بکھر بکھر جاتی۔

چھٹیاں بیت جاتیں، بچے واپس لوٹ جاتے، ڈھیروں پھیلاوے، گندے باتھ روم، کچرے سے بھرے ڈسٹبن، کچن کمرے، سب طرف بکھری گھریلو اشیا اور بہت سا خالی پن......سناٹا اور تھکن سے نڈھال خنسا اس محاذ پر تنہا ہوتی۔ بچوں کے فون آتے ہم پہنچ گئے ہیں، خیریت سے...... بہت اچّھا ٹائم گزرا...... آپ ٹھیک ہیں نا...... پریشان نہ ہوں اگلی چھٹی میں انشاءاللہ پھر آجائیں گے۔

اگلی صبح، بس کنڈکٹر کی مس کال..........دوڑے بھاگتے خنسا کے قدم......اب وہ آئندہ آنے والی چھٹیوں سے خوف زدہ ہے!

□□□

Dr. Amber Abid
H.No. 14, Near Mohammadi Masjid
Khawaspura, Shahjahanbad
Bhopal-462001 (U.P)
Mob:9399631898

سیل

افسانہ جونپوری

اٹھائیس فروری کو شہر میں ہر سال کی طرح اس سال بھی سیل لگی تھی۔جس میں روزمرہ کے سامان، اونی کپڑے، شال، سویٹر، کمبل اور اون وغیرہ بہت سی اشیاء خرید وفروخت ہورہی تھی۔ آج صبح سمینہ کے شوہر فخر اس سے کہہ رہے تھے۔"سمینہ میری دوکان کے پاس وہ جو ساجد بھائی ہیں نا۔۔۔۔وہ بتارہے تھے کہ آج شہر میں سیل لگنے والی ہے اور وہاں پر اونچی اونچی دکانوں کے چپل، جوتے، کپڑے وغیرہ بھی بیچنے کے لیے نکالتے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے اس لیے میں نہیں جاسکتا۔آج تم اپنی اماں کے ساتھ بازار چلی جانا اور میرے اور رامش کے لیے دو۔دو جوڑی چپل لے لینا۔سنا ہے بڑی مضبوط ہوتی ہیں۔"

سمینہ اپنے گھر کی مالی حالت سے بخوبی واقف تھی۔فخر کی آمدنی میں گھر کا خرچ جیسے تیسے چل جاتا تھا وہی بہت تھا۔ پر ان ہی پیسوں میں سے برانڈیڈ دوکانوں کے سامان خریدنے کی تو اس کی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ہاں سیل کے وقت وہی سامان بھلے ہی آدھے آدھ میں مل جائے تو وہ ان کم پیسوں میں بھی کام چلا لیتی تھی۔

سمینہ اور فخر ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے والے ہم سفر تھے۔سمینہ فخر کی کسی بات کو کبھی نہیں ٹالتی تھی۔فخر بھی ہمیشہ اپنی محبت سے سمینہ کو کبھی کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا۔اس لیے آج جب فخر نے سمینہ سے سیل میں جانے کی بات کہی تو وہ اسے انکار نہیں کرسکی اور فوراً ہامی بھرلی۔جبکہ اس کا جانے کا بالکل بھی من نہیں ہورہا تھا۔وہ جانتی تھی کہ وہاں سیل کے نام پر صرف بھدا مذاق ہی ہوگا۔کپڑے تو ایسے کی پسند آنے پر جب تھیلی سے باہر نکال کر دیکھو تو استعمال شدہ معلوم ہوتے اور جو نئے ہوتے وہ بھی زیادہ تر بدرنگ ہوتے۔سیل میں زیادہ تر ریجیکٹیڈ سامان ہی ہوتے ہیں۔بہت ہی چھان پھٹک کے بعد دو ایک کچھ ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتے۔ورنہ سب کے سب لوکوالٹی کے ہی ہوتے ہیں۔سمینہ نے شوہر کی

باتوں پر ہامی تو بھر لی۔۔۔ پر اسے چند سال پہلے گزرا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔

وہ اور اس کی اماں کیسے شاہی پل کے اس پار اٹھائیس فروری کی سیل میں گئیں تھیں۔ اور وہاں سے واپسی پر پل پر اس قدر رش تھا کہ وہ دونوں پل کے اس پار سے اس پار واپس نہیں آ پا رہی تھیں اور اس جام میں ایسے پھنس گئیں تھیں مانو کہ اماں کا دم وہیں گھٹ جائے گا۔ ان کی حالت دیکھ کر سمینہ کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ اماں کو یہاں کیوں لے آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظر پل کے دائیں جانب سے اترتے ہوئے لوگوں پر پڑی کہ کچھ لوگ شاہی پل سے اتر کر من بھاؤنا پل پر جانے لگے تھے۔ پل سے اتر کر وہاں سے جانا بھی بہت مشکل کام تھا۔ پل سے نیچے ندی کے کنارے ریت مٹی کی ڈھلان پر سے اماں کا ہاتھ پکڑے جان بچاتے ہوئے دھیرے دھیرے اس پل سے اس پل تک کیسے کیسے پہنچی تھی۔ اس بھیڑ سے نکلنے کا یہی ایک راستہ بھی تھا۔ کیونکہ بھیڑ کی وجہ سے شہر کی تمام سڑکوں پر ایسے ہی جام لگا ہوا تھا۔ خیر وہ شاہی پل کے نیچے اتر کر من بھاؤنا پل سے دھکا مکی سے بچ بچا کر اپنے گھر پہنچ پائیں۔ اور من ہی من ارادہ کیا کہ اب ہم دوبارہ کبھی سیل میں نہیں جائیں گے۔ جس میں ہمیں اپنی جان جوکھم میں ڈالنی پڑے۔

"آج پھر وہی اٹھائیس فروری تھی، وہی منظر تھا اور وہی دونوں ماں بیٹی ۔۔۔۔۔اور شہر کی وہی دھکا مکی ریل پیل والی بھیڑ۔ گرمی کی شروعات تھی۔۔۔۔ پر یوں لگ رہا تھا کہ شدید گرمی کا موسم آگیا ہو۔ سورج اپنا قہر برسا رہا تھا۔ گرمی کی شدت سے گلہ سوخ رہا تھا۔ سمینہ کے جسم میں ہلکی پھلکی سی جو طاقت باقی تھی وہ بھی جواب دینے لگی تھی۔ جیسے ہی وہ اس بھیڑ میں گھسی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ وہیں غش کھا کر گر پڑی۔ نا جانے اماں نے اسے کیسے سنبھالا۔ جب ہوش میں آئی تو اس نے خود کو بیڈ پر پایا۔ اور اماں پر نظر پڑتے ہی سمینہ نے ایک سانس میں سارے سوال داغ ڈالے۔"

آج پھر وہی اٹھائیس فروری تھی، وہی منظر تھا اور وہی دونوں ماں بیٹی ۔۔۔۔۔اور شہر کی وہی دھکا مکی ریل پیل والی بھیڑ۔ گرمی کی شروعات تھی۔۔۔۔ پر یوں لگ رہا تھا کہ شدید گرمی کا موسم آ گیا ہو۔ سورج اپنا قہر برسا رہا تھا۔ گرمی کی شدت سے گلہ سوخ رہا تھا۔ سمینہ کے جسم میں ہلکی پھلکی سی جو طاقت باقی تھی وہ بھی جواب دینے لگی تھی۔ جیسے ہی وہ اس بھیڑ میں گھسی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ وہیں غش کھا کر گر پڑی۔ نا جانے اماں نے اسے کیسے سنبھالا۔ جب ہوش میں آئی تو اس نے خود کو بیڈ پر پایا۔ اور اماں پر نظر پڑتے ہی سمینہ نے ایک سانس میں سارے سوال داغ ڈالے۔

"اماں میں نے چپل لی تھی۔۔۔۔۔۔؟؟؟

رامش کیا پہنے گا۔۔۔۔۔؟؟؟

اس کے ابو کیا کہیں گے۔۔۔؟؟؟ کہ میں نے چپل نہیں لی"۔

اس کی آواز میں درد اور افسوس کا ملا جلا سا سنگم تھا۔۔۔۔۔

فخر اور رامش اس کے پاس بیٹھے اس کی باتیں سن کر مسکرا رہے تھے کہ وہ ان کے لیے کتنی فکر مند ہے۔

فخر مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔"

ارے بیگم میں کیا کہوں گا؟؟؟۔ ہاں میں اس بات پر غصہ ضرور ہوں......کہ.....

تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اٹھائیس فروری کو اس قدر رش رہتا ہے۔ کہ لوگ بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔۔۔۔

فخر کی بات پر سبھی کے قہقہے چھوٹ گئے۔

اماں نے پھر بڑے پیار سے سمینہ کے سر پر ہاتھ پھیر کے بتایا کہ "تم پریشان مت ہو بیٹی چپل آ گئی ہے۔" سمینہ نے ایک بار پھر سے سوالیہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"کون نے لایا؟؟؟"

اماں نے کہا: "ارے پگلی چپل تو تم نے ہی خریدی تھی۔ بس غشی کی وجہ سے تمھیں یاد نہیں"۔۔۔۔۔

فخر شرارتی لہجے میں سمینہ کو چھیڑنے لگا "ارے بیگم یہ کہو کہ اس سیل نے تمھاری پوری یادداشت نہ لی۔۔۔۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو ۔۔۔۔۔نہ جانے ہمارا کیا ہوتا۔ آخر ایک لوتی بیگم جو ٹھہری۔۔۔۔۔

فخر کی بات پر سمینہ اسے گھورنے لگی۔۔۔۔ اور ایک بار پھر سب کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہر سی دوڑ گئی۔

□□□

Afsana Bano

Mohalla: Phool Mandi,

Chachakpur, Post: Sadar,

Dist: Jaunpur-222001 (UP)

E-mail:afasan0897gmail.com

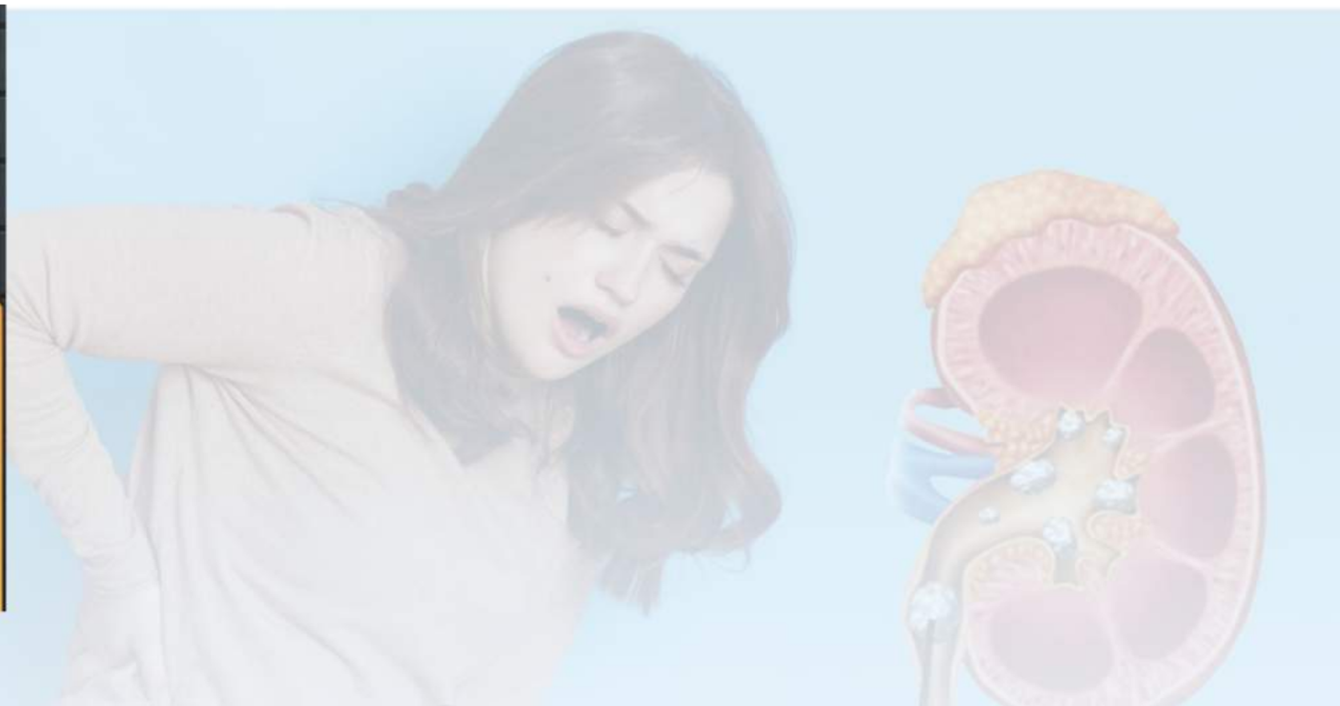

گردے اور مثانے کی پتھری

سنگ گردہ اور مثانے کا سبب مادّی غلیظ اور لیسدار مادّہ ہوتا ہے جیسے بلغم، پیپ یا غلیظ خون۔ اس قسم کا کوئی مادہ جب گردے یا مثانے میں جمع ہوتا ہے اور اس میں سنگ گردہ اور مثانہ کا سبب فاعلی یعنی حرارت غریبہ ناریہ اثر کرتی ہے تو آہستہ آہستہ اس کی رطوبات خشک ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ کچھ مدّت بعد وہ سخت اور متحجر ہو جاتا ہے۔ اسی متحجر مادہ کو سنگ گردہ یا مثانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس کے انعقاد میں مادّے کی چیک اور اس کے لیس کی کمی اور زیادتی کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ چنانچہ اگر مادہ کافی غلیظ اور لیسدار ہوتا ہے تو سخت اور نہ ٹوٹنے والی پتھری پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس میں معمولی غلاظت اور لیس ہوتی ہے تو بُھر بُھری اور جلد ٹوٹ جانے والی پتھری کی پیدائش کا موجب ہوتی ہے، اور اگر غلاظت اور لیس بہت ہی کم ہو تو پھر صرف ریت بن کر رہ جاتا ہے جسے قوت دافعہ آہستہ آہستہ اسی حالت میں خارج کرتی رہتی ہے اور پتھری کا انعقاد نہیں ہوتا۔ سنگ گردہ خاص طور سے ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن کے گردے اور مثانے کا درمیانی راستہ قدرتی طور پر تنگ ہو یا ورم یا کسی غلیظ اور لیسدار خلط کے اجتماع سے سدہ پیدا ہو جانے کے باعث تنگ ہو گیا۔ ہو ایسے لوگوں میں پیشاب کا صاف اور رقیق حصہ تو تھوڑا تھوڑا کر کے مثانے کی طرف جاتا رہتا ہے اور غلیظ حصہ گردے میں جمع ہو کر حصاۃ کا موجب بنتا ہے۔

عورتوں میں حصاۃ کی پیدائش بہت کم ہوتی ہے۔ خصوصاً حصاۃ مثانہ تو تقریباً عورتوں کو لاحق ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان میں جو راستہ مثانے سے خارج کی طرف آتا ہے وہ بہت ہی چھوٹا، کشادہ اور کم پیچیدا ہوتا ہے۔ اس لیے پیشاب کا رقیق اور غلیظ ہر حصہ بسہولت تمام کا تمام خارج ہو جاتا ہے۔

علامات

سنگ گردہ کی صورت میں پہلے پیشاب مکدّر آئے گا جس میں سرخ یا زردی مائل ریگ خارج ہوگا۔ اس کے بعد پتھری کا انعقاد ہو جائے گا تو پیشاب صاف آنے لگے گا۔ کمر میں گردوں کے مقام پر بوجھ اور تناؤ محسوس ہوگا۔ یہاں تک کہ مریض کو ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی شے اس کی کمر سے لٹکی ہوئی ہے۔ خصوصاً جب مریض جھکے گا تو یہ کیفیت زیادہ محسوس ہوگی۔ آنتوں میں براز کے اجتماع کی صورت میں مریض دباؤ کی وجہ سے گردے کے مقام پر درد محسوس کرے گا۔ بعض اوقات ماؤف گردے کی جانب حصہ اور پیڑو میں بھی خدر کے ساتھ تکلیف پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دریدوں اور شیریانوں کے ذریعہ سے ان کا آپس میں تعلق ہے۔ گردے کے مقام پر سخت درد ہوگا جو عموماً دوروں اور نوبتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ نوبت کے وقت درد میں اس قدر شدّت ہوتی ہے کہ بسا اوقات درد قولنج کا اشتباہ ہو جاتا ہے۔ مگر ان علامات کے ذریعہ سے جو قولنج کے بیان میں ذکر کی جا چکی ہیں، بآسانی تمیز کی جاسکتی ہے۔

سنگ مثانہ میں مثانہ کے مقام پر اوراس کے ارد گرد درد ہوگا، عضومخصوص میں خارش آئے گی اور کبھی کبھی اس میں لغوظ (استادگی) پیدا ہوجائے گا جو کچھ دیر کے بعد بغیر کسی سبب کے خود بخود ہی زائل ہوجایا کرے گا۔ پیشاب سفید آئے گا جو ریگ خارج ہوگا وہ یا تو سیاہی مائل ہوگا یا خاکستری یا سفید۔ پیشاب یا تو تنگی سے آئے گا یا بالکل بند ہوجائے گا۔ بعض اوقات خروج مقعد کی بھی شکایت ہوجائے گی۔ پیشاب کر چکنے کے بعد فوراً ہی مریض کو پھر پیشاب کی شکایت محسوس ہوا کرے گی۔ اگر کسی وقت مریض کا پیشاب بند ہوجائے گا تو مریض کو چت لٹا کر اس کے پیر اوپر کی طرف اٹھا کر مثانہ پر گرم پانی کا نطول کرائیں اور مثانہ کے مقام پر دباؤ ڈالنے سے مریض کو بسہولت اچھی طرح کھل کر پیشاب آجائے گا۔ کیونکہ ان تدابیر سے مثانہ کے منہ سے پتھری ہٹ جائے گی۔

علاج

لطیف اور زود ہضم غذائیں استعمال کرائیں جیسے چوزۂ مرغ اور بکری کے بچے کے گوشت کا شوربہ۔ خلومعدہ کی حالت میں مریض کو ہلکی ورزش کرائیں اور اس کے ہضم کو تقویت پہنچانے کی کوشش کریں تاکہ غلیظ اخلاط نہ پیدا ہوں۔ اس کے بعد پتھری کو توڑنے والی ادویہ کے ذریعہ سے پتھری کو توڑیں۔ مثلاً خارخسک خورد، پودینۂ خشک، افسنطین رومی، تخم کرفس، حب کاکنج، بادیان، برگ سداب بری، تخم خیار، پرسیاؤشاں وغیرہ دواؤں سے حسب ضرورت گولیاں یا معجون بنا کر کھلائیں، سکنجبین عنصلی دیں۔ جس میں پتھری کو توڑنے والی اور خارج کرنے والی بہت سی جڑیں اور بیج شامل ہوں۔

درد گردہ میں شدّت کے وقت باسلیق کی فصد کھولیں بشرطیکہ خون غالب ہو۔ اگر قبض ہو تو ملیّن مرض اور مدر دواؤں کا حقنہ کرائیں۔

خارخسک، بابونہ، تخم شبت، تخم کرفس، کرم کلہ پرسیاوشاں، تخم اسپست، تخم قرطم حلبہ اور بنفشہ وغیرہ پانی میں پکا کر اس میں مریض کو بٹھائیں اور مدر دوائیں اسی حالت میں پلائیں یعنی مریض آبزن ہی میں ہوتا کہ مجاری کے ڈھیلے پن اور کشادگی کی حالت میں مدر ادویہ آسانی کے ساتھ پتھری کو خارج کرسکیں۔ پھر آبزن سے نکلنے کے بعد مریض کی پشت پر روغن خیری روغن شبت اور روغن بنفشہ وغیرہ کی مالش کریں اور مریض کو حرکت دیں اور اس کی پیٹھ کو ہلائیں نیز اس کو اوپر سے نیچے کو دکود کر اُترنے کا مشورہ دیں اور ایک پیر پر کھڑا ہو کر چلے۔ اگر ان تدبیروں سے پتھری نیچے اُتر کر خارج ہوجائے تو بہتر ہے ورنہ اگر وہ کسی مجری میں اٹک جائے اور نیچے نہ اُترے تو اس مقام سے کچھ نیچے محاجم لگا کر چوسیں تاکہ پتھری موضع محاجم کی طرف جذب ہو کر آجائے۔ نیز پھیلانے والے لعابات، مثلاً لعاب تخم خطمی، لعاب تخم کتاں، لعاب حلبہ وغیرہ میں روغن قرطم شامل کر کے حصہ کریں تاکہ یہ لعابات آنتوں سے مجاری بول کی طرف مترشح ہو کر ان میں استرخا پیدا کردیں۔

زلال فلوس خیارشنبر میں روغن بادام ملا کر پلائیں۔ یہ بھی مرخی اور مزلق ہے۔ اگر کوئی سنگریزہ مجری قضیب میں اٹک جائے تو قضیب کو گرم پانی میں رکھیں اور احلیل میں مناسب تیل اور لعابات کی پچکاری کریں، نیز اس کو اوپر سے نیچے کی طرف آہستہ آہستہ ملیں۔ اگر کسی وقت درد بہت ہی شدید ہو تو ادویہ مخدرہ مثلاً فلونیا وغیرہ سے مدد لے سکتے ہیں۔

سنگ مثانہ کا بھی بعینہ یہی علاج ہے۔ البتہ اس میں بہ نسبت سنگ گردہ کے زیادہ قوی دوائیں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مثانہ گردہ کی بہ نسبت معدے سے کافی دور ہے جس کی وجہ سے وہاں پہنچتے پہنچتے دواؤں کی قوتوں کے کمزور ہونے کا احتمال ہے۔ علاوہ بریں مثانہ کا مزاج بھی سرد ہے اور اس میں پتھری بھی بہ نسبت گردے کے بڑی پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات بیضۂ مرغ کے برابر ہوجاتی ہے نیز سنگ مثانہ میں روغن عقارب وغیرہ مفتت حصاۃ ادویہ کا احلیل میں پچکاری کرنا بہت مفید ہوتا ہے۔ اگر سنگ مثانہ چکنا ہو اور تفتت کو قبول نہ کرے تو پھر عنق مثانہ شق کر کے اس کو نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عمل صرف سن صبی میں کیا جاسکتا ہے اس کے بعد خطرناک ہے۔

منتخب ومجرب نسخے

1۔ سفوف

سنگ گردہ اور سنگ مثانہ کے لیے عام طور پر مفید ہے۔

حجرالیہود، سنگ سرماہی، مغز کرنجوہ، صمغ عربی ہر ایک 12 گرام۔

خاکستر عقرب 3 گرام۔

سفوف بنا کر رکھ لیں۔ یہ سفوف 6 گرام شربت انگور 25 گرام میں ملا کر کھائیں۔ اوپر سے صبح کو خارخسک خورد 6 گرام، تخم خیارین 6 گرام، تخم خزپزہ 6 گرام پانی میں نکال کر شربت بزوری معتدل 36 ملی لیٹر میں ملا کر پئیں۔

اگر اس میں آب مروق گل داؤدی، مردق تازہ 36 گرام اضافہ کرلیں تو بہت قوی ہوجاتا ہے۔

2۔ دوا

یہ نسخہ سنگ گردہ ومثانہ اور درد گردہ کے لیے قابل اعتماد طور پر

مجرّب ہے۔

قلمی شورہ 12 گرام، فلفل سیاہ 36 گرام دونوں کو آہنی کڑاہی میں ڈال کر آگ پر رکھیں۔ جب دونوں پگھل جائیں تو ہلا کر کورے مٹی کے برتن میں ڈال کر سرد کریں۔

4½ گرام صبح و شام درد گردہ کے لیے لسّی کے ساتھ اور پتھری کے لیے مولی کے پانی کے ساتھ کھائیں۔

3۔ دواءالحصاۃ

ایسے درد گردہ کے لیے کامیاب ہے جس کا سبب پتھری ہو۔ سنگ گردہ اور سنگ مثانہ کے لیے بھی مفید ہے۔

شورہ قلمی 70 گرام میں قدرے پانی ڈال کر آگ پر رکھیں۔ جب پکنے لگے تو حجرالیہود جو نہایت باریک پیس لیا گیا ہو ڈال کر پلائیں۔ جب خشک ہونے کے قریب ہو تو نوشادر 6 گرام، سہاگہ 3 گرام باریک پیس کر ملا دیں۔ آخر میں پوست ریٹھا 1 عدد خوب باریک پیس کر ملا کر اتار لیں۔ جب سرد ہو جائے اور خشک ہو جائے خوب باریک کر کے محفوظ رکھیں۔ خوراک 125 ملی گرام سے ایک گرام تک ہمراہ شیربزہ 125 ملی لیٹر پانی یا عرق کاسنی 125، ملی لیٹر ملا کر صبح شام استعمال کریں۔

4۔ سفوف

یہ نسخہ سفوف سنگ گردہ اور مثانہ کے لیے بہت مفید اور معمول و مجرب ہے۔ حجرالیہود، سنگ سرماہی، سہاگہ بریاں، حب القلت نوشادر، پھٹکری بریاں، حب کاکنج، تخم ترب، تخم شبت، زیرہ سفید، ریوند چینی، دانۂ ہیل کلاں، کباب چینی، شورۂ قلمی جوا کھار ہر ایک گرام نبات سفید 90 گرام کوٹ چھان کر محفوظ رکھیں اور 2½ گرام سے 5½ گرام تک مناسب بدرقہ کے ہمراہ کھلائیں۔

5۔ دوا

یہ نسخہ سنگ گردہ اور مثانہ کو ریزہ ریزہ کر کے خارج کر دیتا ہے۔ بھانٹل (جس کو جنگلی گوبھی بھی کہتے ہیں) زرگل کا پانی 400 گرام ہر ایک، شورۂ قلمی، پھٹکری سُرخ ہر ایک 125 گرام سب کو ملا کر مٹی کے برتن میں ڈال کر نرم آگ پر پکائیں۔ یہاں تک کہ پانی جذب ہو کر دوا خشک ہو جائے۔ اس کے بعد نیچے اُتار کر پیس لیں۔ پھر وزن کر کے اس کے برابر حجرالیہود اور اسی قدر نمک ترب ملا کر اچھی طرح پیس لیں اور شیشی میں بند کر لیں اور ضرورت کے وقت 6 گرام سفوف مندرجہ ذیل جوشاندے کے ساتھ کھلائیں۔

نسخہ جوشاندہ:

خارخسک خورد 36 گرام، حب القلت، پکھان بید، بادیان، تخم خیاریں، تخم خرپزہ، تخم کرفس ہر ایک 12 گرام، تخم پیاز، تخم مولی ہر ایک 2 گرام، دانۂ الائچی کلاں 3 گرام پانی میں جوش دے کر مل چھان کر پئیں۔

اگر ایک خوراک سے کام نہ چلے تو ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ایسی ایک اور خوراک دیں۔

ورم مثانہ

زیادہ تر مثانہ میں ورم گرم پیدا ہوتا ہے۔ یہ ورم ابتداءً بھی ہو سکتا ہے لیکن اکثر پہلے مثانہ میں حصاۃ (پتھری) کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس کے بعد پتھری کی تکلیف اور خارش سے مثانہ کی طرف مواد گرنے لگتا ہے اور ورم پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ گرنے والے مواد گرم ہوتے ہیں اس لیے یہ ورم گرم ہوتا ہے۔

علامات

مادّے کی حدّت (تیزی) اور مثانہ کے عصبی ہونے کی وجہ سے درد نہایت شدید ہوتا ہے غشاء مثانہ میں تمدد پیدا ہونے کی وجہ سے چبھن کا بھی احساس ہوتا ہے، پیشاب رُک جاتا ہے، بخار نہایت تیز ہوتا ہے، ہذیان کی شکایت ہوتی ہے، زبان سیاہ ہو جاتی ہے، پیڑو پھول جاتا ہے اور بعض اوقات پیشاب کے ساتھ پاخانہ بھی رُک جاتا ہے۔ نیز کبھی کبھی پیڑوں میں مثانہ کے مقام پر سرخی نمایاں ہو جاتی ہے۔

علاج

باسلیق کی فصد کھولیں۔

بنفشہ خطمی، خبازی وغیرہ سرد اور ملیّن دوائیں پکا کر مریض کو اس میں بٹھائیں۔ مثانہ پر روغن بنفشہ وغیرہ کا نطول کریں۔

کنجد مقشر آردمیدہ دونوں کو دودھ میں پیس کر لیپ کریں۔

شلجم، برگ کرم کلا، گل بابونہ اور خارخسک بھی ضماداً مفید ہے اور آرد باقلا، گل بنفشہ اور خطمی کو آب کاسنی سبز، آب مکو سبز میں پیس کر قیروطی ملا کر لیپ لگائیں یا گل بابونہ، تخم کتاں اور آرد باقلا کو پختہ مٹی میں پیس کر ضماداً استعمال کریں۔ اگر ان تدابیر سے ورم تحلیل ہو جائے تو بہتر اور اگر تحلیل نہ ہو اور پکنے لگے تو پھر اس کو پکانے اور پھوڑنے کی تدابیر عمل میں لائیں۔

□□□

(بحوالہ: درد علامت اور علاج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سنہ اشاعت 2002)

مراسلہ

خواتین دنیا ماہ فروری 2023 کا شمارہ موصول ہوا۔شفیقہ فرحت کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انھوں نے ڈرامے اور انشائیے بھی لکھے لیکن ان کی شہرت ومقبولیت کی اصل وجہ ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں سماج کے سلگتے مسائل پر آواز بلند کرتی ہیں۔ وہ سماجی، تہذیبی مسائل کا حل تلاش کرتی ہیں۔

اشرف رفیع ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ ان کا خواتین کا ڈراما خوبصورت بلا بہت مقبول ہے۔ اس ڈرامے نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ان کے مزاحیہ کرداروں میں جرسلا، ماشااللہ، ڈالی اور ممتاز کے کردار اہم ہیں۔ ان کے ڈرامے میں نیکی اور بدی کے کردار پسند کیے گئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر اردو فکشن میں خواتین کے مسائل کو تاریخی، تہذیبی، معاشی وسماجی پس منظر میں پیش کرنے میں مہارت رکھتی تھیں۔ انھوں نے سات ناول لکھے۔ قرۃ العین حیدر نے ناولوں کے علاوہ ناولٹ بھی لکھے جن میں دلربا، سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو اور چائے کے باغ وغیرہ اہم ہیں۔

ادب نہ صرف ہمارے دوسرے اعمال وافعال کی طرح زندگی کے معاشی واقتصادی اور سماجی پہلو سے براہ راست تعلق رکھتا ہے بلکہ انسانی زندگی سماجی اور معاشرے کی تمام ناگوار تلخ وشیریں کیفیات کا اظہار ہے۔

صاحبہ شہر یار عہد حاضر میں ایک توانا اور فعال شاعرہ کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے چار مجموع (1) شاخ لرزاں (2) ترک چنار (3) کرب زار (4) آگہی کا درد بہت مقبول ہیں۔ اس شعر کو ملاحظہ فرمائیں:

عجیب بات ہے بھائی کو بھی معلوم
جہاں میں فرض جو ہوتا ہے اک بھائی کا

ندا فاضلی جدیدیت کے دور کے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی نظمیں عوام کی توجہ کا باعث ہیں۔

یہ فاصلہ جو میرے اور تمھارے درمیاں ہے
ہر اک زمانہ کی داستاں ہے نہ ابتدا نہ انتہا ہے

بشن چودھری

خواتین دنیا کا فروری کا شمارہ ملا!

ماشاءاللہ یہ جریدہ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے خاص کر مضامین کا حصہ۔ مہر فاطمہ کا کلاسیکی شاعری میں رقیب کا کردار کو حاصل شمارہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو موضوع کا انوکھا پن اور اس پر سادگی اور روانی لیے انداز بیاں اس کی جان ہیں۔ ڈاکٹر مسرت اور نصرت جہاں دونوں نے ندا فاضلی کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے جو پسند آئی۔ واقعی وہ ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کے بہت سے اشعار تو زبان زد خاص وعام ہیں:

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گزر کیوں نہیں جاتا
وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دور ہے وہ دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

کہانیوں میں ڈاکٹر نسرین کی کسک اور فاطمہ قاضی کی 'مبارک ہو' دونوں کا پس منظر تقریباً ایک جیسا ہے۔ دونوں میں کچھ نیا پن نہیں ہے۔ جو کہانی خود کو لکھوا لے اس کی تاثیر دیر پا ہوتی ہے۔ صاحبہ فردوس کی 'خوش قسمت' ان لوگوں کے لیے چشم کشائی ہے جو مصنوعی خوشیوں اور شو آف کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ جب کہ اصل زندگی اور اصل خوشی کچھ اور چیز ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

منتخب اشعار کے تحت انیتا سونی کے یہ اشعار:

جھرنوں کے درمیاں سے گزرنے لگی ہے شام
بھیگی ہوئی فضا سے نکھرنے لگی ہے شام
سونے نہ دے گی چین سے پھر رات بھر مجھے
آنکھوں میں دھیرے دھیرے اترنے لگی ہے شام
دیکھ کر شہر یار کی غزل یاد آ گئی
پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اتری ہمارے گھروں میں رات
آنکھوں کو سب کی نیند دیے خواب بھی دیے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

ریحانہ احمد، تالتلہ لین، کولکاتہ

فروری ماہ کا 'خواتین دنیا' موصول ہوا۔ فروری ماہ کا شمارہ مادری زبان پر ہے۔ مدیر اعلیٰ نے اداریہ میں زبانوں کے حوالے سے بات کی ہے۔ زبان کسی بھی قوم کی شناخت کا اہم ذریعہ ہوتی ہے۔ زبان کی نشوونما کا دارومدار اس قوم کے افراد پر منحصر کرتا ہے۔ مدیر اعلیٰ نے اسی بات کو اپنے اداریہ میں یوں قلمبند کیا ہے:

''قوم کی نشوونما میں بھی زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مادری زبان انسانوں میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے اور عوام کی رہنمائی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ زبان انسانوں کی تشکیل میں اہم رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک کی تعمیر و تشکیل میں بھی معاون کردار ادا کرتی ہے۔ مادری زبان سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ ہر ایک شعبے میں مادری زبان کا اہم رول ہے۔ بچپن سے ہم جو زبان بولتے اور سنتے ہیں اس سے ہم دلی وابستگی رکھتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا طالب علم کے لیے بھی آسان ہوتا ہے۔ معلم کے لیے بھی اس کی اپنی مادری زبان میں تعلیم دینا آسان ہوتا ہے۔ تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ایک معلم کے لیے زبان پر مکمل دسترس رکھنا بہت ضروری ہے۔''

مذکورہ شمارے میں دس مضامین شامل ہیں۔ شخصیت کے تحت 'شفیقہ فرحت کے طنز و مزاح کی فکری جہات' مضمون قلمبند کیا گیا ہے۔ جہان نسواں کے تحت پانچ مضامین درج ہیں۔ اعتراف ہنر کے تحت ایک مضمون دیا گیا ہے۔ 'شخص اور شاعر' کے تحت تین مضامین درج ہیں۔ حسن سخن میں سیدہ نسرین نقاش، عائشہ صدیقہ جے اور ہاجرہ خاتون کی نظمیں اور غزلیں موجود ہیں۔ سیدہ نسرین نقاش کی غزل بہت پسند آئی۔ ان کی غزل کے یہ اشعار قابل مطالعہ اور لائق ستائش ہیں:

جاگتی ہوئی آنکھوں کو کوئی خواب دکھا دے
تو عید سے پہلے مجھے مہتاب دکھا دے
لگتا ہے بہت دن سے وہ مصروف سخن ہے
اے دل اسے جا کر دل بیتاب دکھا دے
تو جس پہ میرے ساتھ بناتا تھا گھروندے
ایک بار وہی گاؤں کا تالاب دکھا دے

عائشہ صدیقہ جے کی نظمیں 'عارضی ہے یہ دنیا' اور ہاجرہ خاتون کی نظمیں 'صنف آہن اور 'احتیاط' قابل مطالعہ ہیں۔ کہانیوں کے تحت تین افسانے درج کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نسرین بیگم کی کہانی 'کسک' میں دنیا کی عیاری کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو وہیں 'مبارک ہو' میں بیٹو کی پیدائش کو قابل رشک بتایا گیا ہے 'خوش قسمت' میں صاحبہ فردوس نے حالات کی ستم ظریفی کو بیان کیا ہے جب وقت بلدتا ہے تو اپنے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور اپنا اسیہ بھی پرایا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ماحولیات اور صحت کے تحت جو مضمون درج ہے وہ صحت کو بنائے رکھنے میں کافی مددگار ہے۔ ہماری صحت میں ماحول اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آج کے دور میں بہت سی بیماریاں فروغ پا رہی ہیں۔ وقت رہتے ان سے بچاؤ کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔

شمارے کے آخر میں قارئین کی رائے کو پیش کیا گیا ہے۔ غرض تمام لحاظ سے 'ماہنامہ خواتین دنیا' بہت بہتر اور کامیاب رسالہ ہے۔ میگزین کے لیے دل کی گہرائیوں سے نیک خواہشات اور دعائیں۔

عائزہ نسیم، فیض کالونی، مظفر پور (بہار)

☐☐☐

خواتین خبرنامہ

ہندوستان کی ہونہار باکسر نکہت زرین دوسری بار عالمی چیمپئن بنیں

نکہت نے فیصلہ کن راؤنڈ میں صبر اور جارحیت کا صحیح امتزاج دکھایا تا کہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ وہ دوسری بار عالمی چیمپئن بننے کی حقدار ہیں۔

نئی دہلی: ہندوستان کی ہونہار باکسر نکہت زرین نے اتوار کو خواتین کی عالمی باکسنگ چمپئن شپ میں ویتنام کی تھی ٹام نگوین کو 5-0 سے شکست دے کر مسلسل دوسری بار عالمی چیمپئن بن گئیں۔

نکہت، جنھوں نے پچھلی بار 52 کلوگرام زمرے میں عالمی چمپئن شپ جیتی تھی، دو بار کے ایشیائی چمپئن نگوین کو شکست دے کر 50 کلوگرام زمرے میں طلائی تمغہ جیتا۔ نکہت نے سیمی فائنل میں کولمبیا کی انگرڈ ویلنسیا کو شکست دے کر فائنل میں داخلہ حاصل کیا تھا۔

دفاعی عالمی چیمپئن نے مکے بازی کے آغاز سے ہی درست مکے لگائے اور نیوین کے حملوں کو بے اثر کرنے کے لیے تیزی سے اپنے پیروں کا استعمال کیا۔ نکہت نے پہلا راؤنڈ 5-0 سے جیتا لیکن ویتنامی باکسر نے اچھی واپسی کرتے ہوئے دوسرا راؤنڈ 3-2 سے جیت لیا۔ نکہت نے فیصلہ کن راؤنڈ میں صبر اور جارحیت کا صحیح امتزاج دکھایا تا کہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ وہ دوسری بار عالمی چیمپئن بننے کی حقدار ہیں۔ نکہت دوسری ہندوستانی باکسر ہیں جنھوں نے عالمی چیمپئن شپ میں دو بار گولڈ میڈل جیتا ہے۔ نکہت سے پہلے میری کوم (2002، 2005، 2006، 2008، 2010 اور 2018) چھ بار یہ کارنامہ انجام دے چکی ہیں۔

اس تاریخی فتح کے بعد نکہت نے کہا کہ ''میں دوسری بار عالمی چیمپئن بننے پر بہت خوش ہوں، خاص طور پر مختلف وزن کے زمرے میں۔ یہ میچ پورے ٹورنامنٹ میں سب سے مشکل تھا اور چونکہ یہ ٹورنامنٹ کا آخری میچ تھا اس لیے میں اپنی توانائی کا بھرپور استعمال کرنا چاہتی تھی۔ یہ ایک ہنگامہ خیز مقابلہ تھا جس نے دیکھا کہ ہم دونوں کو وارننگ کے ساتھ ساتھ آٹھ پوائنٹ بھی ملے۔ فائنل راؤنڈ میں میری حکمت عملی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کرنا تھی اور جب میرا ہاتھ فاتح کے طور پر اٹھایا گیا تو میں بہت خوش تھی۔ یہ تمغہ ہندوستان اور ان تمام لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے پورے ٹورنامنٹ میں ہمارا ساتھ دیا۔

نکہت آئندہ اولمپکس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سال کے ٹورنامنٹ کے لیے فلائی ویٹ سے لائٹ فلائی ویٹ میں چلی گئی تھی۔ تلنگانہ سے تعلق رکھنے والی 26 سالہ باکسر نے نہ صرف نئے وزن کے زمرے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا بلکہ انھوں نے اپنی گولڈن مہم میں ٹاپ سیڈ افریقی چیمپئن رومیسا بوولم اور دومرتبہ ورلڈ چیمپئن شپ میڈلسٹ تھائی لینڈ کی چوتھامت رکشات کو بھی شکست دی۔

باکسنگ فیڈریشن آف انڈیا کے صدر اجے سنگھ نے نکہت کی جیت پر کہا کہ " نکہت کو مسلسل دوسرے سال عالمی چیمپئن بننے پر مبارکباد۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ملک کے لیے سونے کا تمغہ جیتنے کے لیے ملک بھر کی نوجوان لڑکیوں کے لیے ایک روشن مثال بن جائیں گی۔" وہ آنے والے برسوں میں چیمپئن بننے والی ہیں اور ہم یقینی طور پر 2024 میں ان کی جانب سے اولمپک میڈل دیکھیں گے۔"

(26 مارچ، قومی آواز، نئی دہلی)

ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپ میں نیتو گھنگھاس نے طلائی تمغہ پر کیا قبضہ، پہلی ہی کوشش میں بن گئیں عالمی چیمپئن

ہندوستان کی نوجوان خاتون باکسر نیتو گھنگھاس نے آج 48 کلو گرام وزن والی کیٹگری میں عالمی چیمپئن کا خطاب اپنے نام کر لیا۔ ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپ میں انھوں نے منگولیا کی مکہ باز کو یکطرفہ مقابلہ میں 0-5 سے شکست دے کر طلائی تمغہ پر قبضہ کیا۔ اب وہ عالمی چیمپئن بننے والی ہندوستان کی چھٹی مکہ باز بن گئی ہیں۔ اس سے قبل ایم سی میری کوم، سریتا دیوی، جینی، لیکھا کیسی، نکہت زریں یہ کمال کر چکی ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ نیتو نے سیمی فائنل مقابلے میں قزاقستان کی الوا بلکی بیکووا کو 2-5 سے سخت مقابلے میں شکست دے کر فائنل میں جگہ بنائی تھی۔ آج جب فائنل مقابلہ کھیلا گیا تو پہلے راؤنڈ کے شروع میں منگولیا کی مکہ باز نے نیتو پر دباؤ بنانے کی بھرپور کوشش کی، لیکن ہندوستانی مکہ باز نے بھی اپنے پنچ کا دَم دکھایا اور واپسی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ نیتو نے مخالف مکہ باز کو غلطی کرنے پر مجبور کیا اور طلائی تمغہ کی طرف اپنا قدم بڑھا دیا۔ پہلے راؤنڈ کی بات کریں تو آخر کے 15 سیکنڈ میں ہندوستانی مکہ باز نے زبردست جارحانہ انداز اختیار کر لیا تھا اور نتیجہ کار یہ راؤنڈ وہ اپنے نام کرنے میں کامیاب رہیں۔

دوسرے راؤنڈ کی بات کریں تو دونوں ہی مکہ باز کے درمیان زبردست مقابلہ دیکھنے کو ملا۔ ایک وقت منگولیا کی مکہ باز نے نیتو پر کلیپ پنچ جڑے، لیکن ان کے پنچ سے نیتو کی جارحیت کم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس دوران ہندوستانی مکہ باز نے اپنا بیلنس گنوا دیا تھا۔ منگولیا کی مکہ باز نے نیتو کو مقابلے سے باہر کرنے کی لگاتار کوشش کی، لیکن ہندوستانی مکہ باز نے شکست نہیں مانی۔ اس دوران انھیں پیلا کارڈ ملا جس نے ہندوستانی شیدائیوں کی فکر میں اضافہ کر دیا تھا۔ پیلے کارڈ کو چھوڑ دیا جائے تو دوسرے راؤنڈ میں نیتو پوری طرح حاوی دکھائی دیں اور شروعاتی 2 راؤنڈ میں ہی نیتو نے چیمپئن بننے کی کہانی لکھ دی تھی۔

تیسرا راؤنڈ بھی بہت قریبی رہا تھا اور ایک وقت تو نیتو اس راؤنڈ میں پیچھے ہو گئی تھیں، لیکن آخر کے 56 سیکنڈ میں منگولیا کی مکہ باز کو پیلا کارڈ مل گیا جس نے نیتو کا جوش بڑھا دیا۔ اس کے بعد تو ہاتھ سے نکلے ہوئے راؤنڈ کے آخر کے 30 سیکنڈ میں نیتو نے کلین پنچ سے پوائنٹس بٹورے اور مقابلہ اپنے نام کر لیا۔ (25 مارچ، قومی آواز، نئی دہلی)

ہندوستان کی نئی عالمی چیمپئن سویٹی بورا کون ہیں؟ جنھوں نے ہر مقابلہ میں سونا کا تمغہ جیتا!

آخرکار برسوں کے دوران تمام مشکلات سے لڑتے ہوئے سویٹی بورا ملک کی سرفہرست خواتین باکسروں میں سے ایک بن کر ابھریں۔ وہ 2014 کی عالمی چیمپئن شپ میں چاندی کا تمغہ جیتی تھیں۔

2022: سینئر نیشنل چیمپئن شپ، بھوپال میں گولڈ
2022: ایشین چیمپئن شپ، اردن میں گولڈ
2021: سینئر نیشنل چیمپئن شپ، حصار میں گولڈ
2021: ایشین چیمپئن شپ، دبئی میں کانسے کا تمغہ
2018: عماخانوف میموریل ٹورنامنٹ، کاسپیسک، روس: سونا

سویٹی بورا ریاستی سطح کی کبڈی کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کے مشورے پر باکسنگ کی طرف اپنی توجہ مبذول کیں۔ بورا نے ٹیم کھیل کے بجائے انفرادی کھیل میں مہارت حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ ایک کسان مہندر سنگھ کی بیٹی سویٹی بورا کو شروع میں رشتہ داروں کی طرف سے بہت سی رکاوٹوں اور مزاحمت پر قابو پانا پڑا۔ ہل والے کھیتوں میں اپنی تمام تر تربیت سے گزرنے کے علاوہ انھیں کبڈی چھوڑنے پر مجبور کیا گیا کیونکہ اگر وہ اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہیں تو انھیں ہریانہ سے باہر جانے کو کہا گیا۔

آخرکار برسوں کے دوران تمام مشکلات سے لڑتے ہوئے سویٹی بورا ملک کی سرفہرست خواتین باکسروں میں سے ایک بن کر ابھریں۔ وہ 2014 کی عالمی چیمپئن شپ میں چاندی کا تمغہ جیتی تھیں۔ ہفتہ کے روز انھوں نے نئی دہلی میں 2023 آئی بی اے خواتین کی عالمی باکسنگ چیمپئن شپ میں طلائی تمغہ جیتا۔

30 سال سویٹی بورا نے حال ہی میں اردن میں ہونے والی ایشین چیمپئن شپ میں بھی گولڈ میڈل جیتا اور بھوپال نیشنل چیمپئن شپ میں اپنے قومی اعزاز کا دفاع بھی کیا۔

2023: آئی بی اے ورلڈ چیمپئن شپ، دہلی میں گولڈ

2014: خواتین کی عالمی چیمپئن شپ، نوبی کوریا: چاندی
2015: ایشیائی خواتین کی باکسنگ چیمپئن شپ، چین: چاندی
2015: 16 ویں سینئر (ایلیٹ) ویمن نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ، گوہاٹی، آسام: گولڈ
2013: 14 واں سینئر خواتین باکسنگ مقابلہ ختیما، اتراکھنڈ: گولڈ
2013: 8 ویں سینئر ویمن نارتھ انڈیا باکسنگ چیمپئن شپ، سری نگر: گولڈ
2012: آٹھویں فیڈریشن کپ خواتین باکسنگ چیمپئن شپ، گوہاٹی، آسام: گولڈ
2012: چوتھی انٹر زونل ویمن نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ، وشاکھاپٹنم، اے پی: گولڈ
2011: ساتویں یوتھ ویمن نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ پٹیالہ، پنجاب: گولڈ، 2011: این سی شرما میموریل فیڈریشن کپ خواتین باکسنگ چیمپئن شپ، اتراکھنڈ: گولڈ، 2011: پہلا یو بی اے کپ خواتین باکسنگ ٹورنامنٹ، حصار ہریانہ: گولڈ۔

(25 مارچ، قومی آواز، نئی دہلی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انیس کے مرثیے (جلد اوّل و دوم)

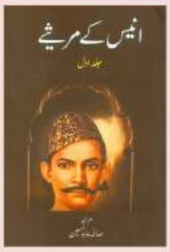

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

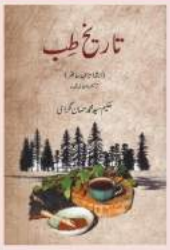

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

دنیا کی بہترین کہانیاں

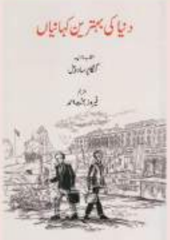

انتخاب و ترتیب: گنگا پرساد ومل

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

نظری تنقید: مسائل و مباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

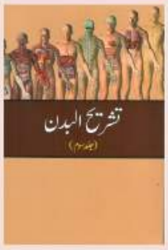

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अप्रैल – २०२३ वर्ष:७, अंक: ४
Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2023, Vol. 7, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-04-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6